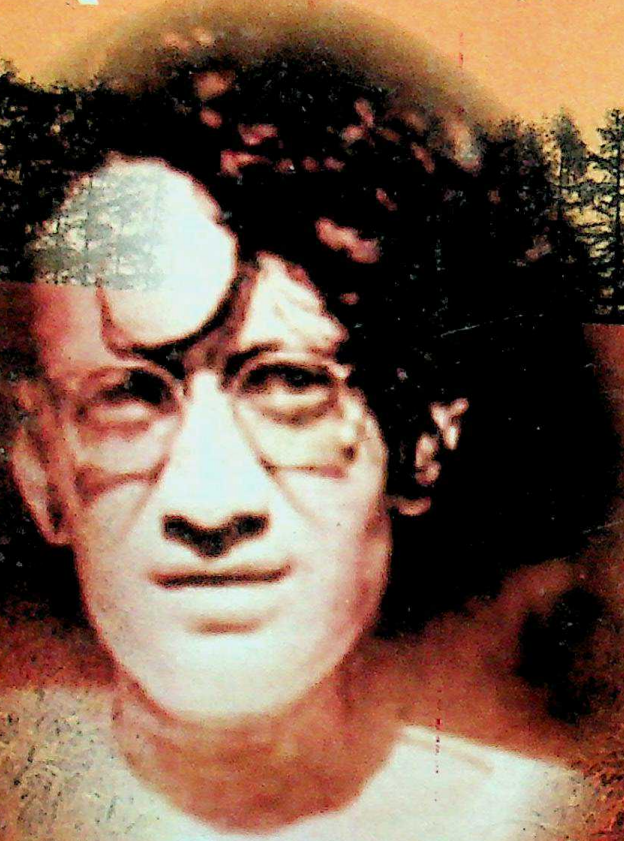


پہلی کتاب منظر

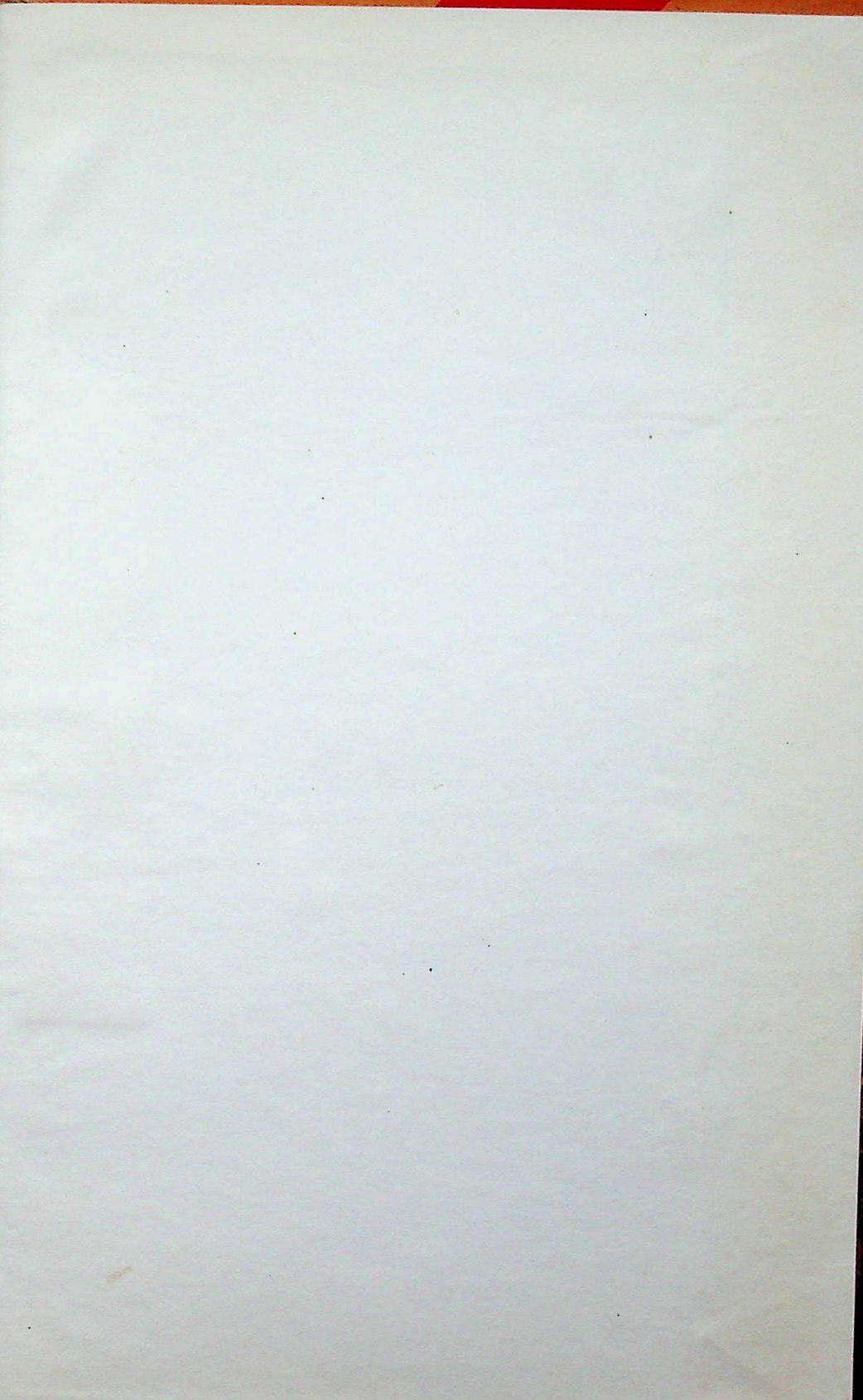
عزت کے لئے

(افسانے - جلد 10)



سعادت حسن منٹو

ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی



WITH LOVE TO
HINDU EDUCATION SOCIETY KASHMIR
FROM :
DR. N.L. ZUTSHI, Mumbai

عزّت کے لئے

(کُلیاتِ منٹو — افسانے، جلد ۱۰)

J.M. College of Education

Raipur, Pantalah

Jammu

Acc No.... 3289 (D)

Dated..... 6-6-19.

عزّت کے لئے

(گُلّیاتِ منٹو — افسانے، جلد ۱۰)

مصنف

سعادت حسن منٹو



تحقیقِ متن و تدوین

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

صدر شعبہ اُردو، بوکارو اسٹیل سٹی کالج

بوکارو (جھارکھنڈ)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

IZZAT KE LIYE

(Kulliyat-e-Manto — Afsane , Vol.10)

by

Saadat Hasan Manto

Edited by

Dr. Humayun Ashraf

Year of 1st Edition 2005

Year of 11nd Edition 2009

ISBN 81-8223-079-9

Price Rs. 70/-

نام کتاب عزت کے لئے (کلیاتِ منٹو — افسانے، جلد ۱۰)
مصنف سعادت حسن منٹو
تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف
سن اشاعت اول ۲۰۰۵ء
سن اشاعت دوم ۲۰۰۹ء
قیمت ۷۰ روپے
مطبع عقیف آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

مثنو شناس

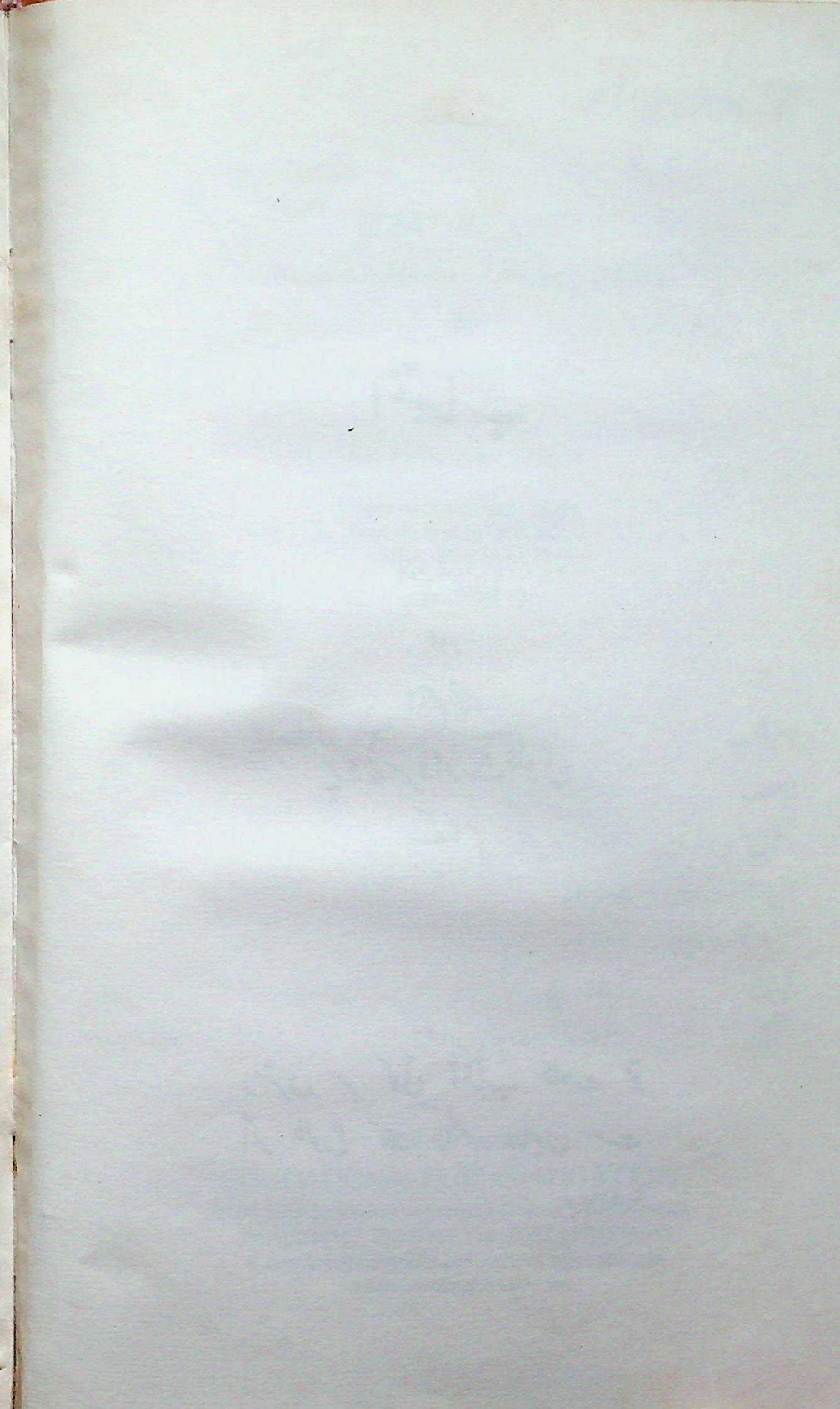
اور

اہم نقاد

پروفیسر وارث علوی

کے نام

زمشرق سرِ کوئی آفتاب طلعت تو
اگر طلوع کند طالعہ ہمایون ست
(حافظ)



پیش لفظ

یہ بات باعث مسرت ہو سکتی ہے کہ اب ایسے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے متون کی طرف توجہ کی جانے لگی ہے جو اکثر و بیشتر انتشار کے عالم میں رہے ہیں اور جتہ جتہ ہی ان پر نظر پڑتی رہی ہے۔ بعض اپنی شاہکار تخلیقات کی وجہ سے پڑھے تو جاتے ہیں لیکن Anthology کی کمی ہمیشہ ایسے فنکاروں کا صرف وہی رخ روشن کرتے رہے ہیں جن کے نمونے ان کے سامنے ہوتے ہیں گویا ان کے مکمل فنی کاوشوں کی بس ایک جھلک ہی کافی ہوتی ہے۔ مغرب میں Complete Works کی اشاعت کا بڑا ہی قدیم سلسلہ ہے لیکن اُردو میں یہ صورت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جن کی موت کو سو دو سو سال ہو چکے، ان کا بھی پورا کلام ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ قدیم شعراء کے کلیات اس سے مستثنیٰ ضرور ہیں لیکن نثر نگاروں کے مکمل متون ہمارے سامنے نہیں ہوتے۔ حد تو یہ ہے کہ اب تک پورا پریم چند ہماری نگاہ میں نہیں ہے۔ ہاں سال دو سال سے پریم چند پر توجہ کی جانے لگی اور اس طرح ان کے مکمل متون کی اشاعت کا کام تیزی سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ پاکستان میں چند نثر نگاروں کی طرف توجہ کی گئی ہے اور ان کی نگارشات کو یکجا کر کے شائع کرنے کا عزم ملتا ہے اور کچھ چیدہ فنکاروں کی Anthology یا Complete Works کا کام انجام پذیر بھی ہوا ہے لیکن بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ترتیب و تنظیم کے وقت عام طور سے اس کا خیال نہیں رکھا گیا کہ صحیح متون ہی پیش کئے جائیں، متنازعہ فیہ امور کی نشاندہی کی جائے، ضروری حاشیے دیئے جائیں، اس طرح کہ نہ صرف متون درست ہوں بلکہ اگر اختلاف کی کوئی صورت ہو تو اس کی صحیح تصویر سامنے آجائے۔

پاکستان کے ایک اشاعتی ادارے نے سعادت حسن منٹو کی کہانیوں اور دوسری تخلیقات کو جمع کر کے چھاپنے کی کوشش کی۔ یہ اشاعت پذیر تو ہوئی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادارے کو اشاعت کی جلدی تھی، اس لئے متون پر وہ توجہ نہیں کی گئی جو ایسے کاموں کی پہلی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کاوش اپنی افادیت کے باوجود تشفی بخش نہیں کہی جاسکتی۔ ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ ترتیب میں ممکن حد تک ہر تخلیق کی اشاعت کی تاریخ درج کی جاتی تاکہ منٹو کے ذہن کے ارتقائی کیف کو گرفت میں لینا ممکن ہو سکتا یا پھر ابجدی صورت اختیار کی جاتی اور ترتیب میں کہانی یا دوسرے موضوعات کے مشتملات اسی ترتیب سے سامنے آتے۔ اس لئے یہ Anthology بہت حد تک اپنے پڑھنے والے کو تاریکی ہی میں رکھتی ہے۔ بہت سے دوسرے پہلو جو کسی بھی Complete Works کے لئے لازمی ہوتے ہیں وہ بطریق احسن برتے نہیں گئے لیکن ان تمام امور کے باوجود اس Anthology نے آگے کے کام کے لئے راہ ہموار کی، اس لئے اس نقطہ نظر سے اس کی ستائش ہونی چاہئے۔

میں نے منٹو کے پھیلے ہوئے کام کو سمیٹنے کی کوشش شروع کی تو اندازہ ہوا کہ یہ مرحلہ بہت سخت ہے، پیچیدہ ہے اور بہت سے مسائل کھڑے کرتا ہے۔ لیکن میں نے آہستہ آہستہ تمام دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کی اور جب اطمینان ہو گیا کہ ایک راہ متعین ہو چکی ہے تو پھر آگے بڑھنا قدرے آسان ہوا۔ سب سے پہلا کام میں نے متون کے موازنے کے سلسلے میں کیا یعنی اگر ایک ہی تخلیق کے کئی متون سامنے ہیں تو ان کی اختلافی صورتوں کی تفہیم کرتے ہوئے قابل ترجیح متن کو قابل اشاعت مناسب جانا۔ اس سلسلے میں زبان کی غلطیوں کی طرف بھی توجہ کی اور ضروری اغلاط کی نشاندہی کرنے میں کہیں تساہل سے کام نہیں لیا۔ منٹو کی بعض تخلیقات میں مرتبہ نے اپنی سہولت، عقائد وغیرہ کی بنا پر بعض حصوں کو یکسر غائب کر دیا یا پھر کسی مصلحت کی بنا پر رنگ آمیزی کر دی گئی۔ یہ بھی ایک حقیقی امر ہے کہ منٹو ایک ہی تخلیق کو متعدد عنوان سے مختلف رسالوں میں شائع کرتے رہے۔ یہ کام خود انہوں نے بھی کیا اور ان کے ناشروں نے بھی ساری حدیں توڑ دیں۔ ان کے افسانے بھی متعدد عنوانات سے شائع ہوتے رہے۔ عام قاری انہیں مختلف افسانے باور

کرتا رہا۔ یہ بھی ہوا کہ ایک ہی کتاب کئی کتابوں کی صورت اختیار کرتی رہی، کبھی ایک دو افسانے کے اضافے کے ساتھ، تو کبھی ایک دو حذف کر کے۔ اس طرح کتابوں کی تعداد مسلسل بڑھتی گئی۔ میں نے ایسے تمام معاملے کی چھان بین کی اور کوشش کی کہ تخلیقات کے Original عنوانات کی تلاش کی جائے اور بقیہ کو کالعدم قرار دیا جائے۔ کتابوں کے جعلی ایڈیشنوں کی نشاندہی سوانحی خاکے یعنی ”منو نامہ“ میں کر دی گئی ہے۔ یہ بھی ہوا کہ ایک ہی افسانہ دو عنوانات کے تحت اشاعت پذیر ہوا۔ ایسی مثالیں متعدد ہیں جیسے ”اپنی اپنی ذلی“ (چند مکالمے)، ”برمی لڑکی“ (پراسرار لڑکی)، ”خدا کی قسم“ (تیقن)، ”سوکینڈل پاور کا بلب“ (سرخ آنکھیں)، ”محمودہ“، (وہ آنکھیں)، ”وہ لڑکی“ (سانولی لڑکی) ”جی آیا صاحب“ (قاسم)، وغیرہ۔ منو کے افسانوں اور دوسری تخلیقات میں ان صورتوں کو واضح کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں غلط اور من مانے عنوانات کو حذف کر دیا گیا ہے۔

بہت سے لوگ منو کو صرف افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن منو صرف اس صنف میں بند نہیں تھا، اس کی نگارشات میں انشائیے، خاکے، ڈرامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔ انہیں ترجمے سے بھی شغف تھا۔ ان اصناف کے حوالے سے منو کے جرات مندانہ رویوں اور بے لاگ تبصروں کی داد دینی چاہئے۔ اُردو کے اس باکمال تخلیق کار کی اہمیت اور معنویت کا اس نقطہ نظر سے اعتراف نہیں ہوا ہے۔ ویسے منو کی فنکاری کا اعتراف کیا جاتا ہے اور باہر کی یونیورسٹیوں میں منو کا متن شامل درس بھی رہتا ہے۔ لیکن جہاں دوسری بڑی ادبی شخصیات پر آئے دن مذاکرے اور مباحثے ہوتے رہتے ہیں، منو کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

منو کے ساتھ زندگی میں تو انصاف نہیں کیا گیا۔ موت کے بعد بھی یہی کیفیت ہے۔ اس لئے کہ اگر زندگی میں بدنامی و رسوائی کا بازار گرم رہا تو موت کے بعد غیر مشروط قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ منو پر گرم ڈسکورس کا ہنوز انتظار ہے۔

مجھے احساس ہوا ہے کہ منو کے بارے میں ابھی تک ذہن صاف نہیں ہے۔ پھر بھی اچھی، بری، اعلیٰ، ادنیٰ آراء کا تصادم منو کے فن کی زندگی کی دلیل ہے۔ لطف کی بات ہے کہ منو کا فن فقط ادبیات ہی کا مسئلہ نہیں ہندوستان کی تحریک آزادی، فسادات، فرقہ وارانہ فسادات،

انسانی اقدار، امن اور متعدد علوم سب کا حصہ ہیں۔ یقین ہے کہ اس Anthology کی اشاعت سے منٹو شناسی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا اور منٹو کے فن کی بہت سی جہتیں مکمل طور پر سامنے آئیں گی، جن کے حوالے سے ان کے فنی سفر اور فن کا از سر نو جائزہ لیا جانا ممکن ہو سکے گا۔

میں نے منٹو کی زندگی کا خاکہ مرتب کرنے میں بھی خاصا وقت صرف کیا ہے۔ کوشش کی ہے کہ نکتہ بہ نکتہ اس کی زندگی کے تمام امور سامنے آجائیں۔ منٹو کی شراب نوشی دراصل اس کی زندگی کی تلخیوں اور فرسٹریشن کی پیدا کردہ تھی۔ اسے بھی جوش ملیح آبادی کی طرح ہندوستان سے ہجرت راس نہیں آئی۔ منٹو جیسے روایت شکن اور Bohemian فنکار کے لئے پاکستان کی پابند زندگی قطعی ناموزوں ثابت ہوئی اور انہوں نے عصمت چغتائی کو ایک خط میں لکھا کہ:

”کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوالو اور اگر مگر جی سے کہہ کر بمبئی بلوالو تو بہت اچھا ہے۔“ لیکن چونکہ منٹو نہایت لا اُبالی تھے اس لئے اس کی یہ فرمائش پوری نہ ہو سکی۔ پاکستان میں پبلشروں نے اسے پریشان اور قلاش بنائے رکھا۔ حکومت نے اس کے افسانوں پر فحش نگاری کے مقدمے چلائے۔ نتیجتاً منٹو ذہنی انتشار کا شکار ہوئے اور اسے پاگل خانے میں بھی داخل ہونا پڑا۔ بہر طور اس سوانحی خاکے کے چند صفحات منٹو کی زندگی کی بحث کے لئے طویل کتاب کی طرف راغب کریں گے۔ یہی میری غایت بھی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تمام قابل ذکر واقعات احاطہ تحریر میں آجائیں۔ لہذا میں نے ایک طرح سے اس خاکے سے منٹو شناسی کی منزل کی طرف اپنے پڑھنے والوں کو لے جانے کی کوشش کی ہے۔

ع صلائے عام ہے یا رانِ نکتہ داں کے لئے

”کلیاتِ منٹو“ کے اشاعتی منصوبے کے تحت پہلے متعدد جلدوں میں منٹو کے افسانے منظر عام پر آئیں گے۔ پھر خاکے، ڈرامے، مضامین، ناول اور تراجم کی ضخیم جلدیں اشاعت پذیر ہوں گی۔

منٹو اردو افسانے کی قد آور شخصیت ہے۔ انہوں نے افسانوں کا ایک وقیع ذخیرہ چھوڑا ہے جس میں اچھے افسانے بھی ہیں اور برے بھی۔ منٹو کے افسانوں میں موضوعات

کاشتووع ہے۔ اس کے افسانوں نے روایتی اور نئے اُردو افسانے کو تازہ تخلیقی جہتیں عطا کی ہیں۔ ”انگارے“ کی اشاعت نے اُردو کی افسانوی روایت میں جس باغیانہ، بے باکانہ اور جرأت مندانہ طرز کی بنیاد ڈالی تھی، اس کا بہتر اور فنکارانہ اظہار منو کے افسانوں میں ہوا۔ منو نے ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جو اس سے قبل اُردو افسانے کے حدود میں شامل نہیں تھے۔ اس نے ممنوعہ اور پردوں کے پیچھے کے کوائف کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں رکھا۔ منو جیسا منفرد افسانہ نگار اُردو کے افسانوی افق پر دوسرا نظر نہیں آتا۔ وہ ایسی باتوں کو جسے دوسرے زبان پر لانے سے ہچکتے ہیں، انتہائی بے باکی سے کہتا ہے لیکن اپنے اظہار کو سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔ بقول وارث علوی:

”منو کی بے لاگ اور سفاک حقیقت نگاری نے بے شمار عقائد، مسلمات اور تصورات کو توڑا اور ہمیں شعلہٴ حیات کو برہنہ انگلیوں سے چھونے کی جرأت کی۔ منو کے ذریعے ہم پہلی بار ان حقائق سے آشنا ہوئے جن کا صحیح علم نہ ہو تو آدمی نرم و نازک اور آرام دہ عقائد کی محفوظ تحویل میں چھوٹی موٹی شخصیتوں کی طرح جیتا ہے۔“

انسانی زندگی اس عظیم فنکار کا موضوع تھا۔ منو نے اپنے معاشرے میں سانس لینے والے ہر طبقے اور ہر طرح کے انسانوں کی رنگارنگ زندگیوں کو، ان کی نفسیاتی اور جذباتی تہہ داریوں سمیت اپنے افسانوں کے کینوس پر منتقل کیا ہے۔ اپنے ارد گرد کے انسان اور ماحول کو اس نے بہت باریکی سے دیکھا تھا۔ ان کی خوشیوں، غموں اور مسئلوں کو محسوس کیا تھا۔ مزدور، طوائف، کلرک، رند خرابات اور زاهد پاکباز، سب کی الجھنیں، مسائل اور ان کا روحانی کرب — مشاہدوں اور تجربوں کے حقیقت پسندانہ اظہار میں اسے یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ منو کے قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس نے مختلف معاشرتی طبقوں کے مختلف کرداروں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ برہنہ حقیقت نگاری ہو یا جذباتی اتار چڑھاؤ کا تخلیقی بیان منو کا قلم و قلموں کر شے دکھا چکا ہے۔ عورت کے جسمانی استحصال اور روحانی قتل کو موضوع فکر بنا کر افسانہ لکھنا اور اپنی تحریر میں اس افسوس ناک صورتحال کے تئیں تمام تر انسانی ہمدردی کو جگا کر رکھ دینا منو کا کمال ہے۔ ”ہنک“ ”سڑک کے کنارے“ ”ٹھنڈا گوشت“ ”سو کینڈل پاؤ کا بلب“ ”خوشیا“

”کھول دو“ ”کالی شلوار“ ”پھندنے“ ”تمی“ ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ اور دیگر افسانے منٹو کے قلمی معراج کا عکس و آئینہ ہیں۔ عورت کے اپنی جسمانی اور معاشی استحصال کو خاموشی سے برداشت کرتے رہنے اور ایک جھٹکے میں اپنے روحانی قتل پر بیدار ہو کر پھر اٹھنے کی کہانی ہے ”ہتک“۔ ”سڑک کے کنارے“ والی عورت کی ایک خاص لمحے میں خود سپردگی اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والی بچی کے متعلق نفسیاتی فشار کا تیز و تند سیلاب، ”ٹھنڈے گوشت“ والے ایشر سنگھ کے گناہ کا اس کی مردانہ حس کو نامردی میں تبدیل کر دینے والے ٹھنڈے احساس کا بوجھ اور ”خوشیا“ دلال کا اپنی جبلت کے زیر اثر دلال سے گاہک بن جانے والے فطری واقعہ کی افسانوی شکل میں قلم بندی منٹو کا عظیم کارنامہ ہے۔ دوسری مثالوں کی کمی نہیں۔

منٹو کو جنس نگار کہنا، منٹو کی توہین ہے۔ منٹو عورت کے خارجی کوائف کے نہیں، اس کے داخلی منظر نامے کے فنکار ہیں۔ اس کا بنیادی مسئلہ جنس نہیں بلکہ زندگی کا الم، عورت کا دکھ اور اس کی روح کی تنہائی ہے۔ اپنے اعلیٰ مقامات پر منٹو کے یہاں جو گہری درد مندی ملتی ہے، ”ممتا“ اور ”کرونا“ کی انتہائی ارفع اور بالیدہ کیفیت سے شناخت کی جاسکتی ہے۔ منٹو بڑا بے باک افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانوں میں جنس کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جنسی مسائل کو وہ اس لئے نہیں پیش کرتا کہ ان سے خود لطف اندوز ہو یا قاری کو سستی لذت بہم پہنچائے۔ سماج میں جو غلاظت اسے نظر آتی ہے۔ وہ اسے دور کرنا چاہتا ہے۔ غلاظت کے سلسلے میں دورویئے ممکن ہو سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس پر خاک ڈالتے چلے جاؤ، غلاظت چھپی رہے گی، بدبودبی رہے گی۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ اسے دیکھو، دوسروں کو دکھاؤ اور اس کے خلاف نفرت پیدا کرو۔ اس کا خاتمہ اسی طرح ممکن ہے۔ منٹو نے یہی طریق کار اختیار کیا۔ لہذا اس کے افسانوں میں جو رنگین نظر آتا ہے وہ اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ سوسائٹی میں قبل سے موجود ہے۔ منٹو جب اس سوسائٹی کی تصویر کھینچتا ہے تو اس ننگے پن کو کس طرح چھپا سکتا ہے۔ اپنی کہانیوں کی بابت خود منٹو رقمطراز ہے:

”زمانے کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب

ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں، یہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں قطعی نقص نہیں۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا، جو ہے ہی تنگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے۔

منٹو نے سوسائٹی میں جو خرابیاں، بدعنوانیاں، بے اعتدالیاں دیکھیں انہیں کھلے لفظوں میں منکشف کر دیا اور یہی ان سے نجات پانے کی صورت تھی۔ معاشرے کی یہ گندگی منٹو کے افسانوں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ”ٹھنڈا گوشت“ ”کھول دو“ ”موزیل“ ”بو“ ”کالی شلوار“ ”دھواں“ ”اللہ دتا“ ”دس روپے“ ”اوپر، نیچے اور درمیان“ ”ہتک“ ”شاداں“ ”بلاؤز“ ”پھابا“ ”خورشت“ ”راجو“ ”ممد بھائی“ ”نطفہ“ ”میرا نام رادھا ہے“ کی برنگی اور بے باکی کا خوب چرچا رہا۔ ان میں سے کچھ پرفاشی کے الزام میں مقدمے بھی چلے۔ طوائفوں اور عیاش عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کے افسانوں کا خاص موضوع ہیں۔ منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور پر بمبئی، پونہ اور دہلی میں گذاری تھی اس نے منٹو کو متعلقہ طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ بقول وارث علوی طوائفوں پر منٹو کے جتنے افسانے ہیں، ہم انہیں جنسی افسانے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ جنس طوائف کی زندگی اور کردار کا حاوی جزو ہے۔ لیکن ”ان افسانوں کے مرکز میں یا تو ”ممتا“ کا جذبہ ہے یا بے بسی اور تنہائی کا، یا بے لوث خدمت گذاری کا، یا پھر طوائف کے کردار کے ایسے پہلوؤں کی آئینہ داری ہے جو اس کی انسانیت اور انسانیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ان افسانوں میں دلچسپی کا مرکز جنس نہیں بلکہ دوسرے نفسیاتی اور اخلاقی عوامل ہیں۔“ (”منٹو۔ ایک مطالعہ، از۔ وارث علوی، ص ۶۷۔)

منٹو نے مذکورہ پہلو کو ”جانکی“ ”شاردا“ ”بری لڑکی“ ”نوبھائی“ ”سڑک کنارے“ ”پھندنے“ ”کالی شلوار“ ”موزیل“ ”بابو گوبی ناتھ“ ”مٹی“ ”شانتی“ ”ہتک“ ”پری“ ”سونورل“ ”سو کینڈل پاؤ کا بلب“ ”شاداں“ ”قادر اقصائی“ ”میرٹھ کی قینچی“ وغیرہ میں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ منٹو عورت کی زندگی، اس کی ذہنیت، اس کی محبت، اس کا ایثار، اس کی قربانی سے بخوبی واقف ہیں۔ عورت سے کچھ

بھی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہئے۔ اس کی محبت میسر ہونی چاہئے۔ منٹو کے دل میں عورت، جنس سے الگ محبت کی دیوی بھی ہے۔ وہ اس کے افسانوں میں اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیتی ہیں۔

منٹو نے ہر موضوع پر افسانے لکھے ہیں۔ خواہ وہ جنسی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا انقلابی، تقسیم ہو یا ہجرت۔ ہر موضوع کے ساتھ اس نے انصاف کیا ہے۔ منٹو انسان کو کبھی بھی اس کے سماجی روابط سے الگ کر کے نہیں دیکھتا جو عام طور پر جرائم کی کہانیوں اور جنسی بے راہ روی کے شکارتہا فرد پر مشتمل کہانیوں کا وطیرہ ہے۔ اس کے افسانے میں لوگوں کی ریل پیل ہے۔ سڑکیں، کوٹھے اور بازار ہیں۔ گھر اور آنگن کی چہل پہل ہے۔ شادی کے ہنگامے ہیں، نکلنا اور چوراہوں کی گہما گہمی ہے۔ سیاسی جلوس، دنگے اور فسادات ہیں۔ کرداروں کی طبقاتی، سماجی، مذہبی اور پیشہ ورانہ مشاغل ہیں۔ منٹو انسانی زندگی کا مطالعہ ہمیشہ اس کے مخصوص طبقاتی اور سماجی پس منظر میں کرتا ہے۔ اس کی فضا بندی، مرقع سازی اور جزئیات نگاری میں کرداروں کے مخصوص ماحول و فضا کی پوری نقش گری ملتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں مواد اور فن دونوں گھل مل جاتے ہیں۔ سفاک حقیقت نگاری، کرداروں کے ظاہر اور باطن کی نقاب کشائی، تعفن اور غلاظت کی پردہ دری اور دلی انسان میں جھانک کر اس کی مسرتوں اور الم ناکیوں کے ابدی سرچشموں کی تلاش، اس کے فن کے امتیازات ٹھہرے۔ جنسی سچائیاں اس کے دامن سے اس طرح پلٹیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا حوالہ بن گئے۔ فنی اور تکنیکی تجربوں کے ساتھ اس نے افسانوی فن کی حرمت بھی بحال رکھی۔ یہی سبب ہے کہ اس کی کہانیاں ”دامنِ دل می کشد“ کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔

منٹو عہد ساز افسانہ نگار ہے۔ اس کے لہجے کا منفرد آہنگ، غیر معمولی انداز بیان، اس کی کردار نگاری کی بے پناہ قوت اور نفسی تجزیہ کی بے مثال صلاحیت کے ساتھ جزئیات نگاری پر قدرت اور اس کی سنسنی خیزی وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب آج کے تناظر میں منٹو کی معنویت کا بھرپور جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ منٹو کے فن کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ منٹو کی کہانیاں انسانی تنگ دلی اور اندھے تشدد کے الم ناک نتائج سے ہماری توجہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی طرف لے جاتی ہیں۔ مابعد جدید نقطہ نظر سے بھی منٹو کے

افسانوی فن کا بھرپور جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ نیز معاشرتی اور کرداری تجزیوں میں منٹو کے حقیقی ویرن کے حوالے سے توجہ دی جاسکتی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا ان کے بعد آنے والی نسل پر کیا اثر مرتب ہوا اور منٹو کے افسانے مروجہ Super Structure کے لئے کیسا خطرہ لاحق ہوا؟ ان امور سے بھی بحث کی جاسکتی ہے۔

”کلیاتِ منٹو“ کی اشاعت سے یقیناً منٹو کے افسانوی فن کے نئے نئے نکات سامنے آئیں گے اور اب منٹو کی افسانہ نگاری کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا معترضین کے لئے بھی آسان نہیں ہوگا۔

میں ممنون ہوں استاذی پروفیسر وہاب اشرفی کا جنہوں نے ”کلیاتِ منٹو“ کی ترتیب و تدوین کی تحریک دی اور علالت کے دوران اس کے لئے ایک بھرپور مقدمہ لکھا اور قدم قدم پر مفید مشوروں سے نوازا۔ موصوف اپنی علالت کے باعث میری زیادہ مدد تو نہ کر سکے لیکن اس عالم میں بھی کام مکمل کرنے کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ میرے لئے یہی بہت تھا۔ شاید ان کی مزید معاونت حاصل ہوتی تو کچھ اور نئے نکات سامنے آتے۔ بہر طور میں نے اپنے طور پر کوشش کی ہے کہ یہ کام ہر طرح مکمل ہو۔ میں موصوف کی کرم فرمایوں کا صمیم قلب سے اعتراف کرتا ہوں اور اللہ سے دعاء کرتا ہوں کہ انہیں طویل عمر اور صحت و عافیت سے نوازے۔ آمین۔

— خدا بخش اور نیٹل پبلک لائبریری، گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ اور نیشنل لائبریری، کلکتہ کے اراکین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے منٹو کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریروں کی فراہمی میں تعاون دیا۔

برادرِ م ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی، ڈاکٹر جمیل اختر محبی، ڈاکٹر امام اعظم، راشد احمد، سید حسین الحق اور محمد سبحان کا ممنون ہوں جنہوں نے ہمت افزائی کی اور ضروری امور میں تعاون کیا۔

عزیزی محمد سرفراز احمد اور محمد ابوکاشف بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی خصوصی توجہ سے پروف ریڈنگ میں سہولت ہوئی۔ شریک سفر نگارینہ اشرف نے بھی اس صبر آزما کام کی انجام دہی میں بھرپور تعاون دیا۔ ان کی معاونت سے ہی اس مشکل پروجکٹ کی تکمیل ہو پائی

ہے، اب بھلا ان کا شکر یہ کیا ادا کروں۔ یہ تو اپنی ذات کا حصہ ہے۔
 میں الحاج محمد مجتبیٰ خان، مالک، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی اور ان کے
 صاحبزادے حاجی محمد مصطفیٰ کمال پاشا کا بھی ممنون اور متشکر ہوں کہ انہوں نے ”کلیات
 سعادت حسن منٹو“ کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی،۔ یوں بھی علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت
 کے ضمن میں یہ اشاعتی ادارہ ہندوپاک میں اپنے امتیازات کی وجہ سے معروف ہے،۔ میں ان
 حضرات کا بھی شکر یہ ادا کرتا ہوں۔

کوئی کتاب نقص سے پاک نہیں ہوتی، اس میں بھی نقائص ہوں گے۔ آپ کی توجہ
 سے اس کی کوتاہیوں کی طرف اشارے کئے گئے تو آئندہ اشاعت میں ان سے روشنی لینا ضروری
 سمجھوں گا۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

بوکاروا سنیل سٹی

۲۷ جنوری، ۲۰۰۴ء



(منٹو کے افسانے - حصہ ”ع، غ، ف، ق“)

WITH LOVE TO
HINDU EDUCATION SOCIETY KASHMIR
FROM :
DR. N.L. ZUTSHI, Mumbai

فہرست

۵	۱۔ عزت کے لئے
۱۲	۲۔ عشق حقیقی
۲۰	۳۔ عشقیہ کہانی
۲۷	۴۔ عقل داڑھ
۳۳	۵۔ عورت ذات
۴۰	۶۔ غالب، چودھویں اور حشمت خاں
۵۱	۷۔ غسل خانہ
۵۸	۸۔ فرشتہ
۶۶	۹۔ فوبہ بانی
۷۶	۱۰۔ قادراقصائی
۸۱	۱۱۔ قبض
۹۱	۱۲۔ قدرت کا اصول
۹۴	۱۳۔ قرض کی پیتے تھے.....
۹۹	۱۴۔ قیمت
۱۰۰	۱۵۔ قیے کی بجائے بوٹیاں
۱۰۹	☆۔ اشاریہ

عزت کے لئے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کہی تھی جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بندل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور یہ جاوہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں وہ ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا، ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا، تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بندل لیتا اور چلا جاتا۔

چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امرتسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پریچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چونی لال منگواتا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے دھننے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت کم بکتے۔ پھر بھی ہر ہفتے

ولایت کی ڈاک کے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام کئی خوبصورت بندل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے اور رسالے بیچنے کے لئے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لئے منگواتا تھا۔ چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بندل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر الگ رکھ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں، شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے۔ اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے راما، بڑا صاف ستھرا اور سونی صدمہ دار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا۔ جس کو صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو دلچسپی نہیں۔ چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے موجود نہ ہو جب بھی ایک بات۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے۔۔۔ یہ اس کو اس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ اس سے سوڈے برف کے لئے کہا جائے یا پانیوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر رامادونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن روپاکو دے دیئے تھے اور جڈی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی۔ اور چونی لال الگ اپنے بمبئی اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے، ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے، مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھا نیدا تھا۔ لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی۔

چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے، اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کر دیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اسے اپنی خواب گاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو، جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں نہیں اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لئے بنوایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں جن سے نشہ کم ہو جاتا تھا۔ ڈر کے مارے کوئی گھر نہ جانا چاہے تو علیحدہ سبجے سجائے دو کرے موجود تھے۔ چھوٹا سا ہال تھا اس میں کبھی کبھی بھرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے۔ لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست اس کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا: ”کیا کہتے ہو یا ر۔ مکان تمہارا اپنا ہے۔“ عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیش نظر ایسا بے تکلف کبھی نہیں ہوتا تھا۔

چونی لال کا باپ لالہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا جب چونی لال قمر ڈو بیٹن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہنچنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پر ڈالیاں آرہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تنخواہ تو بس سیدھی بینک چلی جاتی تھی، لیکن ریٹائرڈ ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹری سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی، لیکن لالہ گردھاری لال نے بے کار مباحث کچھ کیا کہ مکانوں کا مسئلہ کھلیا شروع کر دیا، اور دوسروں ہی میں آدمی سے زیادہ جائیداد گنوا دی۔ پھر لمبی بیماری نے آگھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری کا حال پتلا ہونے کے ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھٹھا اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم

جلیس، ہم پیالہ وہم نوالہ تھا، لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ و منزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا جو ایک بت سے پجاری کا ہوتا ہے یا ایک آقا سے ایک غلام کا۔

ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی جو اب اس کے دل و دماغ میں تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا، اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے، یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیئے ہوئے امر کی اور انگریزی پرچے ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دنوں کی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے جس سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہو سکتی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا ہجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا شرمیلہ میٹا ہرنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہو گئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ و رسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہرنس جس نے تقیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی اہل تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ہرنس کا شوق پورا کرنے کے لئے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی۔ لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔۔۔ لڑکے کو شراب پینی آگئی تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہرنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملنے دیا۔

جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہرنس ہی کی دوستی کافی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں کر لیتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کرائی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے اور انھیں اپنا ممنون احسان بنانے کا، بلکہ یوں کہئے کہ ان کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات طاری کرنے کا کہ بھی کمال ہے۔۔۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔

ایک کو خوش سمجھتے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقع ملے اور اس سے بدلہ لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں۔۔۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے اس نے کام کیا، لیکن صرف ان ہی کے لئے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز ہی کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو بیڑھیوں کے نیچے تھا شراب اور بیڑی کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔

ہرنس کا لہڑپن اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دسترخوان بچھا کر نئی چیزیں اس کے لئے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان میں موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول کو انگلی پر گھما رہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا۔ بلوائی؟۔۔۔ نہیں!۔۔۔ راما؟۔۔۔ نہیں! وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آ رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہرنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہرنس کا رنگ ہلدی کے گامبھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے۔ چونی لال نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ آواز ہرنس کے سوکھے ہوئے گلے میں انک گئی۔ چونی لال نے اس کو دلاسا دیا۔ ”گھبراہٹ نہیں۔۔۔ بتائیے کیا ہوا ہے؟“ ہرنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ لہو بند ہی نہیں ہوتا!“

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی۔ لیکن وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کے گھر میں اس کے مہمان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں تو چونی لال کا دماغ غیر معمولی طور پر مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہرنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا۔ ”میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں آپ گھبراہٹ نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جس میں ہرنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کرتا رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔۔۔ نہیں بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے تنگ دناموں کا محافظ ہے۔

راما؟ — کرفو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آرہا تھا۔ برف؟ — ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفز-بجر میٹر موجود تھا۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس نے سوچا کچھ بھی ہو کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا ہی پڑے گا۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساکوان کے اسپرنگوں والے پٹک پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ”بھینا!“

چونی لال نے بھینچی ہوئی آواز میں کہا۔ ”روپا!“ اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سا لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہرنس کو پتہ نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے۔ چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

دلیز میں ہرنس کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ چونی لال کو دود بکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہرنس کی ٹانگیں کاٹنے لگیں۔

چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خطا بکڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر تعق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہرنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا۔ مگر ہرنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہرنس زور سے چیخا اور دوڑ کر اس میں داخل ہوا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔

چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہرنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے، لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ دونوں چونی لال اور ہرنس کچھ دیر خاموش رہے۔ لیکن ہرنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا۔ ”میں — میں — مجھے کچھ معلوم نہیں — یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے

--- اس مسلمان سب انپکڑ کی --- کیا نام ہے اس کا محمد طفیل --- ہاں ہاں محمد طفیل --- نہیں نہیں
 --- بشیر احمد --- نہیں محمد طفیل --- وہی طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی --- اس نے مجھے یہ لڑکی
 لا کر دی اور کہا مسلمان ہے --- مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا ---
 تم --- تم --- تم بولتے کیوں نہیں --- اور اس نے جھٹا شروع کر دیا --- ”تم بولتے کیوں نہیں --- تم
 مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو ---“ تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو --- لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم
 نہیں تھا --- مجھے کچھ معلوم نہیں تھا --- مجھے کچھ معلوم نہیں تھا ---“

چونی لال نے ہولے سے کہا --- ”گھبرائیے نہیں --- آپ کے پتاجی کی عزت کا سوال
 ہے ---“ لیکن ہرنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ
 دیا۔ تیسرے روز کرفوٹنے پر چونی لال کے دونوں کروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا اسٹال کھولا۔ تازہ
 اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لئے اخباروں اور رسالوں کا ایک بڈل باندھ کر الگ
 رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔

کئی راہ چلتے آدھیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ
 موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار
 کر خودکشی کر لی۔



عشق حقیقی

عشق و محبت کے بارے میں اخلاق کا نظریہ وہی تھا جو اکثر عاشقوں اور محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ رانجھے پیر کا چپلا تھا۔ عشق میں مرجانا اس کے نزدیک عظیم الشان موت مانتا تھا۔ اخلاق تیس برس کا ہو گیا مگر باوجود کوششوں کے اس کو کسی سے عشق نہ ہوا۔ لیکن ایک دن انگریز برگ مین کی پکچر ”فورہوم دی بل ٹولز“ کا مینیٹیوڈ دیکھنے کے دوران میں اس نے محسوس کیا اس کا دل اس برقعہ پوش لڑکی سے وابستہ ہو گیا ہے جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور سارا وقت اپنی ٹانگیں ہلاتی رہی تھی۔

پردے پر جب سائے کم اور روشنی زیادہ ہوئی تو اخلاق نے اس لڑکی کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے تھکے تھکے قطرے تھے۔ ناک کی پھٹک پر چند بوندیں تھیں۔ جب اخلاق نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی ٹانگ ہلنا بند ہو گئی۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنے سیاہ برقعے کی جالی سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ یہ حرکت کچھ ایسی تھی کہ اخلاق کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس لڑکی نے اپنی سیملی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے نہیں۔ اس کے بعد اس لڑکی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا لیا۔ اخلاق کی طرف تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا اور ٹانگ ہلا کر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

اخلاق سگریٹ پی رہا تھا۔ انگریز برگ مین اس کی محبوب ایکٹرس تھی۔ فورہوم دی بل ٹولز میں اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ فلم کے آغاز میں جب اخلاق نے اسے دیکھا تو وہ بہت ہی پیاری معلوم ہوئی۔ لیکن ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھنے کے بعد وہ انگریز برگ مین کو بھول

گیا۔ یوں تو قریب قریب سارا فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلا کر اس نے بہت ہی کم دیکھا۔
سارا وقت وہ لڑکی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔

اخلاق سگریٹ پر سگریٹ بیٹا رہا۔۔۔ ایک مرتبہ اس نے راکھ جھاڑی تو اس کا سگریٹ انگلی سے نکل کر اس لڑکی کی گود میں جا پڑا۔۔۔ لڑکی فلم دیکھنے میں مشغول تھی۔ اس لئے اس کو سگریٹ گرنے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اخلاق بہت گھبرایا۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے برقعے پر سے اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ لڑکی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اخلاق نے فوراً کہا۔ ”معافی چاہتا ہوں آپ پر سگریٹ گر گیا تھا۔“

لڑکی نے تیکھی تیکھی نظروں سے اخلاق کی طرف دیکھا اور بیٹھ گئی۔ بیٹھ کر اس نے اپنی سہیلی سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ دونوں ہولے ہولے نہیں اور فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔
فلم کے اختتام پر جب قائد اعظم کی تصویر نمودار ہوئی تو اخلاق اٹھا۔ خدا معلوم کیا ہوا کہ اس کا پاؤں اس لڑکی کے پاؤں کے ساتھ ٹکرایا۔ اخلاق ایک بار پھر سر تاپا معذرت بن گیا۔
”معافی چاہتا ہوں۔ جانے آج کیا ہو گیا ہے۔“

دونوں سہیلیاں ہولے ہولے نہیں۔ جب بھیڑ کے ساتھ باہر نکلیں تو اخلاق ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ لڑکی جس سے اس کی پہلی نظر کا عشق ہوا تھا مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ اخلاق نے اس کی پروا نہ کی اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کا مکان دیکھ کے رہے گا۔

مال روڈ کے فٹ پاتھ پر دائی ایم سی اے کے قریب لڑکی نے مڑ کر اخلاق کی طرف دیکھا اور اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑ کر رک گئی۔ اخلاق نے آگے نکلنا چاہا تو وہ لڑکی اس سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ ہمارے پیچھے پیچھے کیوں آرہے ہیں؟“

اخلاق نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا۔ ”آپ میرے آگے آگے کیوں جارہی ہیں۔“
لڑکی کھل کھلا کر ہنس پری۔ اس کے بعد اس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔ پھر دونوں چل پڑیں۔ بس اسٹینڈ کے پاس اس لڑکی نے جب مڑ کر دیکھا تو اخلاق نے کہا۔ ”آپ پیچھے آجائے۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔“

لڑکی نے منہ موڑ لیا۔

انارکلی کا موڑ آیا تو دونوں سہیلیاں ٹھہر گئیں۔ اخلاق پاس سے گزرنے لگا تو اس لڑکی نے اس سے کہا۔ ”آپ ہمارے پیچھے نہ آئیے۔ یہ بہت بری بات ہے۔“

لہجے میں بہت سنجیدگی تھی۔ اخلاق نے ”بہت بہتر“ کہا اور واپس چل دیا۔ اس نے مڑ کر بھی ان کو نہ دیکھا۔ لیکن دل میں اس کو افسوس تھا کہ وہ کیوں اس کے پیچھے نہ گیا۔ اتنی دیر کے بعد اس کو اتنی شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کو کسی سے محبت ہوئی ہے لیکن اس نے موقع ہاتھ سے جانے دیا۔ اب خدا معلوم پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

جب وائی ایم سی اے کے پاس پہنچا تو رک کر اس نے انارکلی کے موڑ کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہاں کیا تھا۔ وہ تو اسی وقت انارکلی کی طرف چلی گئی تھی۔

لڑکی کے نقش بڑے پتلے پتلے تھے، باریک ناک۔۔۔۔۔ چھوٹی سی ٹھوڈی، پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ۔۔۔۔۔ جب پردے پر سائے کم اور روشنی زیادہ ہوتی تھی تو اس نے اس کے بالائی ہونٹ پر ایک تل دیکھا تھا جو بے حد پیارا لگتا تھا۔ اخلاق نے سوچا تھا کہ اگر یہ تل نہ ہوتا تو شاید وہ لڑکی نامکمل رہتی۔ اس کا وہاں ہونا اشد ضروری تھا۔

چھوٹے چھوٹے قدم تھے جن میں کنوار پن تھا۔ چونکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک مرد میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس لئے ان کے ان چھوٹے چھوٹے قدموں میں ایک بڑی پیاری لڑکھڑاہٹ سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا مزہ مڑ کر دیکھنا تو غضب تھا۔ گردن کو ایک خفیف سا جھکادے کر وہ پیچھے اخلاق کی طرف دیکھتی اور تیزی سے منہ موڑ لیتی۔

دوسرے روز وہ انگریز بگ مین کا فلم بھر دیکھنے گیا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ والٹ ڈزنی کا کارٹون چل رہا تھا کہ وہ اندر ہال میں داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ کیپر کی بیڑی کی اندھی روشنی کے سہارے اس نے ٹٹل ٹٹل کر ایک خالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ڈزنی کا کارٹون بہت مزاحیہ تھا۔ ادھر ادھر کی تماشائی ہنس رہے تھے۔ دفعتاً بہت ہی قریب سے اخلاق کو ایسی ہنسی سنائی دی جس کو وہ پہچانتا تھا۔ مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا تو وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

اخلاق کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لڑکی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اس کا بھائی لگتا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ کس طرح بار بار مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔

انٹرول ہو گیا۔ اخلاق کو شش کے باوجود فلم اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ روشنی ہوئی تو وہ اٹھا۔ لڑکی کے چہرے پر نقاب تھا۔ مگر اس حسین پردے کے پیچھے اس کی آنکھیں اخلاق کو نظر آئیں جن میں مسکراہٹ کی چمک تھی۔

لڑکی کے بھائی نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اخلاق نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ”ذرا ماچس عنایت فرمائیں۔“

لڑکی کے بھائی نے اس کو ماچس دے دی۔ اخلاق نے اپنا سگریٹ سلگایا اور ماچس واپس دے دی۔ ”شکریہ!“

لڑکی کی ٹانگ ہل رہی تھی۔ اخلاق اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قلم کا ہتھکڑا شروع ہوا۔ ایک دوسرے اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔

قلم ختم ہوا۔ لوگ باہر نکلنے شروع ہوئے۔ لڑکی اور اس کا بھائی ساتھ ساتھ تھے۔ اخلاق ان سے ہٹ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اسٹینڈ کے پاس بھائی نے اپنی بہن سے کچھ کہا، ایک ٹانگے والے کو بلایا۔ لڑکی اس میں بیٹھ گئی۔ لڑکا اسٹینڈ رڈ میں چلا گیا۔ لڑکی نے قطب میں سے اخلاق کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگہ چل پڑا۔ اسٹینڈ رڈ کے باہر اس کے تین چار دوست کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کی سائیکل اس نے جلدی جلدی پکڑی اور ٹانگے کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

یہ تعاقب بڑا دلچسپ رہا۔ زور کی ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر سے قطب اٹھ اٹھ جاتی۔ سیاہ جار جٹ کا پردہ پھڑپھڑا کر اس کے سفید چہرے کی جھلکیاں دکھاتا تھا۔ کانوں میں سونے کے بڑے بڑے جھومر تھے، پتلے پتلے ہونٹوں پر سیاہی مائل سرخی تھی۔ اور بالائی ہونٹ پر تل۔ اور اشد ضروری تل۔ بڑے زور کا جھونکا آیا تو اخلاق کے سر پر سے ہیٹ اتر گیا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس کے وزنی پہنچنے کے نیچے آیا اور وہیں چت ہو گیا۔ لڑکی ہنسی اور اخلاق مسکرا دیا۔ گردن موڑ کر ہیٹ کی لاش دیکھی جو بہت پیچھے رہ گئی تھی اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس کو تو شہادت کا رتبہ مل گیا۔“

لڑکی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

اخلاق تھوڑی دیر کے بعد پھر اس سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کو اعتراض ہے تو واپس

چلا جاتا ہوں۔“

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔

انارکلی کی گلی میں ٹانگہ رکھا اور وہ لڑکی اتر کر اخلاق کی طرف بار بار دیکھتی قطب اٹھا کر ایک مکان میں داخل ہو گئی۔ اخلاق ایک پاؤں سائیکل کے پیڈل پر اور دوسرا پاؤں دکان کے تھڑے پر رکھے تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ سائیکل چلانے ہی والا تھا کہ اس مکان کی پہلی منزل پر ایک

کھڑکی کھلی۔ لڑکی نے جھانک کر اخلاق کو دیکھا مگر فوراً ہی شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔ اخلاق تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں کھڑا رہا۔ مگر وہ پھر کھڑکی میں نمودار نہ ہوئی۔

دوسرے روز اخلاق صبح سویرے انارکلی کی اس گلی میں پہنچا۔ پندرہ بیس منٹ تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ کھڑکی بند تھی۔ مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا کہ ایک فالسے بیچنے والا صدا لگاتا آیا۔ کھڑکی کھلی، لڑکی سر سے ننگی نمودار ہوئی۔ اس نے فالسے والے کو آواز دی۔

”بھائی فالسے والے ذرا ٹھہرنا“ پھر اس کی نگاہیں ایک دم اخلاق پر پڑیں۔ چونک کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فالسے والے نے سر پر سے چھابڑی اتاری اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی سر پر دوپٹے لئے نیچے آئی۔ اخلاق کو اس نے تنکھيوں سے دیکھا۔ شرما کر اس نے فالسے لئے بغیر واپس چلی گئی۔ اخلاق کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ فالسے والے نے جب اس کو گھور کے دیکھا تو وہاں سے چل دیا۔ ”چلو آج اتنا ہی کافی ہے۔“

چند دن ہی میں اخلاق اور اس لڑکی میں اشارے شروع ہو گئے۔ ہر روز صبح نو بجے وہ انارکلی کی اس گلی میں پہنچتا۔ کھڑکی کھلتی۔ وہ سلام کرتا وہ جواب دیتی، مسکراتی، ہاتھ کے اشاروں سے کچھ باتیں ہوتیں۔ اس کے بعد وہ چلی جاتی۔

ایک روز انگلیاں گھما کر اس نے اخلاق کو بتایا کہ وہ شام کے چھ بجے کے شو سنیما دیکھنے جا رہی ہے۔ اخلاق نے اشاروں کے ذریعہ اسے پوچھا۔ ”کون سے سنیما ہاؤس میں“ اس نے جواب میں کچھ اشارے کئے مگر اخلاق نہ سمجھا۔ آخر میں اس نے اشاروں میں کہا۔ ”کاغذ پر لکھ کر نیچے پھینک دو۔“

لڑکی کھڑکی سے ہٹ گئی۔ چند لمحات کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کاغذ کی ایک مروڑی سی نیچے پھینکی دی۔ اخلاق نے اسے کھولا۔ لکھا تھا

”پلازا۔۔۔ پروین“

شام کو پلازا میں اس کی ملاقات پروین سے ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی سہیلی تھی۔ اخلاق اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قلم شروع ہوا تو پروین نے نقاب اٹھالیا۔ اخلاق سارا وقت اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ انٹرول سے کچھ پہلے اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اخلاق نے فوراً ہاتھ اٹھالیا۔ دراصل وہ اس کو انگوشی دینا چاہتا تھا بلکہ خود پہنانا چاہتا تھا جو اس نے اسی روز خریدی تھی۔ انٹرول ختم ہوا تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کانپ لگی۔ لیکن اخلاق نے ہاتھ نہ ہٹایا۔ تھوڑی

دیر کے بعد اس نے انگوٹھی نکالی اور اس کی ایک انگلی میں چڑھادی۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ اخلاق نے اس کی طرف دیکھا، پیشانی اور ناک پر پسینے کے تھکے تھکے قطرے تھر تھارہے تھے۔

فلم ختم ہوا تو اخلاق اور پروین کی یہ ملاقات بھی ختم ہوگئی۔ باہر نکل کر کوئی بات نہ ہو سکی۔ دونوں سہیلیاں ٹانگے میں بیٹھیں۔ اخلاق کو دوست مل گئے۔ انہوں نے اسے روک لیا۔ لیکن وہ بہت خوش تھا، اس لئے کہ پروین نے اس کا تحفہ قبول کر لیا تھا۔

دوسرے روز مقررہ وقت پر جب اخلاق پروین کے گھر کے پاس پہنچا تو کھڑکی کھلی تھی۔ اخلاق نے سلام کیا۔ پروین نے جواب دیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں اس کی پہنائی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

تھوڑی دیر اشارے ہوتے رہے۔ اس کے بعد پروین نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لفافہ نیچے پھینک دیا۔ اخلاق نے اٹھایا کھولا تو اس میں ایک خط تھا۔ انگوٹھی کے شکریے کا۔

گھر پہنچ کر اخلاق نے ایک طویل جواب لکھا۔ اپنا دل نکال کر کاغذوں پر رکھ دیا۔ اس خط کو اس نے پھول دار لفافے میں بند کیا۔ اس پریسٹ لگایا اور دوسرے روز صبح نو بجے پروین کو دیکھا کر نیچے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

اب ان میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔ ہر خط عشق و محبت کا ایک دفتر تھا۔ ایک خط اخلاق نے اپنے خون سے لکھا جس میں اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ اپنی محبت میں ثابت قدم رہے گا۔ اس کے جواب میں خونی تحریر ہی آئی۔ پروین نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مرجائے گی لیکن اخلاق کے سوا اور کسی کو شریک حیات نہیں بنائے گی۔

مہینوں گزر گئے۔ اس دوران میں کبھی کبھی سینما میں دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ مل کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ پروین پر گھر کی طرف سے بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ باہر نکلتی تھی تو اپنے بھائی کے ساتھ یا اپنی سہیلی زہرہ کے ساتھ۔ ان دو کے علاوہ اس کو اور کسی کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اخلاق نے اسے کئی مرتبہ لکھا کہ زہرہ کے ساتھ وہ کبھی اسے بارہ درری میں یا جہانگیر کے مقبرے میں ملے مگر وہ نہ مانی۔ اس کو ڈر تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔

اسی اثنا میں اخلاق کے والدین نے اس کی شادی کی بات چیت شروع کر دی۔ اخلاق مالتارہا۔ جب انہوں نے تنک آکر ایک جگہ بات کر دی تو اخلاق بگڑ گیا۔ بہت ہنگامہ ہوا۔ یہاں تک کہ اخلاق کو گھر سے نکل کر ایک رات اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں سونا پڑا۔ ادھر پروین روتی رہی۔ کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اخلاق دھن کا بہت پکا تھا۔ ضدی بھی پر لے درجے کا تھا۔ گھر سے باہر قدم نکالا تو پھر ادھر رخ تک نہ کیا۔ اس کے والد نے اس کو بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا۔ ایک دفتر میں سو روپے ماہوار پر نوکری کر لی اور ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ جس میں تل تھا نہ بجلی۔ ادھر پروین اخلاق کی تکلیفوں کے دکھ میں گھل رہی تھی۔ گھر میں جب اچانک اس کی شادی کی بات چیت شروع ہوئی تو اس پر بجلی سی گری۔ اس نے اخلاق کو لکھا وہ بہت پریشان ہے۔ پروین کو اس نے تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ ثابت قدم رہے۔ عشق ان کا امتحان لے رہا ہے۔ بارہ دن گزر گئے۔ اخلاق کئی بار گیا۔ مگر پروین کھڑکی میں نظر نہ آئی۔ وہ صبر و قرار کھو بیٹھا، نیند اس کی غائب ہو گئی۔ اس نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ ناغے ہوئے تو اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ برطانی کا نوٹس ملا تو وہ سیدھا پروین کے مکان کی طرف چل پڑا۔ پندرہ دنوں کے طویل عرصے کے بعد اسے پروین نظر آئی۔ وہ بھی ایک لچلے کے لئے۔ جلدی سے لفافہ پھینک کر وہ چلی گئی۔

خط بہت طویل تھا۔ پروین کی غیر حاضری کا باعث یہ تھا کہ اس کا باپ اس کو اپنے ساتھ گوجرانوالہ لے گیا تھا جہاں اس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ پندرہ دن وہ خون کے آنسو روئی رہی۔ اس کا جہیز تیار کیا جا رہا تھا اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لئے رنگ برنگے کفن بن رہے ہیں۔ خط کے اخیر میں لکھا تھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں مرجاؤں گی۔ میں ضرور کچھ کھا کے مرجاؤں گی۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں نہیں ایک اور راستہ بھی ہے۔ لیکن میں کیا اتنی ہمت کر سکوں گی۔ تم بھی اتنی ہمت کر سکو گے..... میں تمہارے پاس چلی آؤں گی۔ مجھے تمہارے پاس آنا ہی پڑے گا۔ تم نے میرے لئے گھر بار چھوڑا۔ میں تمہارے لئے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی، جہاں میری موت کے سامان ہو رہے ہیں۔ لیکن میں بیوی بن کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم شادی کا بندوبست کر لو۔ میں صرف تین کپڑوں میں آؤں گی۔ زیور وغیرہ اتار کر یہاں پھینک دوں گی۔

جواب جلدی دو، ہمیشہ تمہاری۔ پروین۔

اخلاق نے کچھ نہ سوچا۔ فوراً اس کو لکھا۔ ”میری باپیں تمہیں اپنے آغوش میں لینے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ میں تمہاری عزت و عصمت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔ تم میری رفیقہ حیات بن کے رہو گی۔ زندگی بھر میں تمہیں خوش رکھوں گا۔“

ایک دو خط اور لکھے گئے اس کے بعد طے کیا گیا کہ پروین بدھ کو صبح سویرے گھر سے

نکلے گی۔ اخلاق ٹانگہ لے کر گلی کے کٹڑ پر اس کا انتظار کرے۔

بدھ کو منہ اندھیرے اخلاق ٹانگے میں وہاں پہنچ کر پروین کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ اخلاق کا اضطراب بڑھ گیا۔ لیکن وہ آگئی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ گلی میں نمودار ہوئی۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب وہ ٹانگے میں اخلاق کے ساتھ بیٹھی تو سر تاپا کانپ رہی تھی۔ اخلاق خود بھی کانپنے لگا۔

گھر پہنچے تو اخلاق نے بڑے پیار سے اس کے برقعے کی نقاب اٹھائی۔ اور کہا۔ ”میری دولہن کب تک مجھ سے پردہ کرے گی۔“

پروین نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کا رنگ زرد تھا جسم ابھی تک کانپ رہا تھا۔ اخلاق نے بالائی ہونٹ کے تل کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں میں ایک بوسہ ترپنے لگ۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تمام کر اس نے تل والی جگہ کو چوما۔ پروین نے نہ نہ کی۔ اس کے ہونٹ کھلے۔ دانتوں میں گوشت خورہ تھا۔ مسوڑھے گہرے نیلے رنگ کے تھے گلے ہوئے سڑاند کا ایک بھبکا اخلاق کی ناک میں کھس گیا۔ ایک دھکا سا اس کو لگا۔ ایک اور بھبکا پروین کے منہ سے نکلا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

پروین نے حیا آلودہ آواز میں کہا۔ ”شادی سے پہلے آپ کو ایسی باتوں کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گلے ہوئے مسوڑھے نمایاں ہوئے۔ اخلاق کے ہوش وحواس غائب تھے۔ دماغ سن ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ دونوں پاس پاس بیٹھے رہے۔ اخلاق کو کوئی بات نہیں سوچتی تھی۔ پروین کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جب اس نے انگلی کا ناخن کاٹنے کے لئے ہونٹ کھولے تو پھر ان گلے ہوئے مسوڑھوں کی نمائش ہوئی۔ بو کا ایک بھبکا نکلا۔ اخلاق کو مٹکی آنے لگی اٹھا اور ”ابھی آیا“ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ایک تھڑے پر بیٹھ کر اس نے بہت دیر سوچا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لائل پور روانہ ہو گیا جہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا۔ اخلاق نے سارا واقعہ سنایا تو اس نے بہت لعن طعن کی اور اس سے کہا۔ فوراً واپس جاؤ۔ کہیں بے چاری خودکشی نہ کر لے۔“

اخلاق رات کو واپس آیا گھر میں داخل ہوا تو پروین موجود نہیں تھی۔ پتک پر تکیہ پڑا تھا۔ اس پر دو گول گول نشان تھے، کیلے!

اس کے بعد اخلاق کو پروین کہیں نظر نہ آئی۔

(۵ جون ۱۹۵۰ء)

عشقِ کہانی

میرے متعلق عام لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ میں عشقِ کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے افسانوں میں چونکہ عشق و محبت کی چاشنی نہیں ہوتی اس لئے وہ بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ میں اب یہ عشقِ کہانی لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کی یہ شکایت کسی حد تک دور ہو جائے۔

جیل کا نام اگر آپ نے پہلے نہیں سنا تو اب سن لیجئے۔ اس کا تعارف مختصر طور پر کرائے دیتا ہوں۔ وہ میرا لنگوٹیا دوست تھا، ہم اکٹھے اسکول میں پڑھے، پھر کالج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ میں ایف اے میں فیل ہو گیا اور وہ پاس۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی مگر اس نے جاری رکھی۔ ڈبل ایم۔ اے کیا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ صرف اتنا سننے میں آیا تھا کہ اس نے ایک پانچ پنچ والی ماں سے شادی کر لی تھی اور آبادان چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا یا وہیں رہا، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

جیل بڑا عاشق مزاج تھا۔ اسکول کے دنوں ہی میں اس کا جی بے قرار رہتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسی گرفتاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی سرگرمیوں میں جو عشق سے متعلق ہوتیں برابر حصہ لیا کرتا تھا۔

جیل دراز قد نہیں تھا مگر اتھے خدو خال کا مالک تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اسے خوبصورت نہ کہا جائے تو اس کے قبول صورت ہونے میں شک و شبہ نہیں تھا۔ رنگ گورا اور سرخی مائل، تیز تیز باتیں کرنے والا بلا کا ذہین، انسانی نفسیات کا طالب علم بڑا صحت مند۔ اس کے دل و دماغ میں سن بلوغت تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی عشق کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس

کو غالب کے اس شعر کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

مگر اس کے برعکس وہ یہ آگ خود اپنی ماچس سے لگانا چاہتا تھا۔

اس نے اس کوشش میں کئی ماچسیں جلائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کئی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لئے نت نئے سوٹ سلوائے، بڑھیا سے بڑھیا ٹائیاں خریدیں، سینٹ کی سینکڑوں قیمتی شیشیاں استعمال کیں مگر یہ سوٹ، ٹائیاں اور سینٹ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

میں اور وہ دونوں شام کو کپہنی باغ کا رخ کرتے۔ وہ خوب سجا ہوا تھا اس کے کپڑوں سے بہترین خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی روشوں پر متعدد لڑکیاں بد صورت، خوبصورت، قبول صورت محو خرام ہوتی تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے عشق کے لئے منتخب کرنے کی کوشش کرتا مگر نا کام رہتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا: ”سعادت! میں نے آخر کار ایک لڑکی چن لی ہے۔ خدا کی قسم چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے۔ میں کل صبح سیر کے لئے نکلا۔ بہت سی لڑکیاں مائی کے ساتھ اسکول جا رہی تھیں۔ ان میں ایک برقع پوش لڑکی نے جو اپنی نقاب ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا حسن و جمال تھا! بس میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ جیل اب مزید تک دو دو چھوڑو، اس حسینہ ہی کے عشق میں تمہیں گرفتار ہونا چاہئے۔ ہونا کیا ”تم ہو چکے ہو۔“ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر اس مقام پر جہاں اس نے اس کا فر جمال حسینہ کو دیکھا تھا، پہنچ جایا کرے گا اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے لئے اس کے ذہن دماغ نے بہت سے پلین سوچے تھے۔ ایک جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل اور زود اثر تھا، اس نے مجھے بتا دیا تھا۔

اس نے حساب لگا کر سوچا تھا کہ دس دن متواتر اس لڑکی کو ایک ہی مقام پر کھڑے رہ کر دیکھنے اور گھورنے سے اتنا معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یعنی وہ کیا چاہتا ہے۔ اس مدت کے بعد وہ اس کا ردِ عمل ملاحظہ کرے گا اور اس تجزیے کے بعد کوئی فیصلہ مرتب کرے گا۔ یہ اغلب تھا کہ وہ لڑکی اس کا دیکھنا گھورنا پسند نہ کرے۔ مائی سے یا اپنے والدین سے

اس کے غیر اخلاقی رویے کی شکایت کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راضی ہو جاتی۔ اس کی ثابت قدمی اس پر اتنا اثر کرتی کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو جاتی۔

جیل نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لئے کہ دوسرے روز جب وہ الارم بجنے پر اٹھا تو اس نے اس مقام پر جہاں اس لڑکی سے اس کی پہلی مرتبہ مل بھیز ہوئی تھی، جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اس نے مجھ سے کہا: ”سعادت، میں نے یہ سوچا کہ ہو سکتا ہے اسکول میں چھٹی ہو کیونکہ جمعہ ہے۔ معلوم نہیں اسلامی اسکول میں پڑھتی ہے یا کسی گورنمنٹ اسکول میں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اسے زیادہ شدت سے گھورتا تو وہ بھٹا جاتی۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ دس دن کے اندر اندر مجھے اس کا ردِ عمل یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا۔ بفرض محال وہ رضامند ہو جاتی، میرا مطلب ہے مجھے بالمشافہ گفتگو کا موقع دے دیتی، تو میں اس سے کیا کہتا!“

میں نے کہا: ”یہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

جیل سنجیدہ ہو گیا: ”یار مجھ سے کبھی کہنا نہ جاتا۔ تم سوچو نا اگر یہ سن کر وہ میرے منہ پر یہ پتھر دے مارتی کہ جناب آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے، تو میں کیا جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کہہ سکتا کہ حضورِ محبت کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ مگر وہ ایک اور پتھر میرے مار سکتی تھی کہ تم بکواس کرتے ہو، کون کہتا ہے کہ تم انسان ہو۔“

قصہ مختصر یہ کہ جیل اس حسین و جمیل لڑکی کی محبت میں خود کو اپنے تجزیہ خودی کے باعث گرفتار نہ کر اسکا۔ مگر اس کی خواہش بدستور موجود تھی۔ ایک اور خوبولڑکی اس کی تلاش کرنے والی نکاہوں کے سامنے آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ اس سے عشق لڑا نا شروع کر دے گا۔ جیل نے سوچا کہ اس سے خط و کتابت کی جائے، چنانچہ اس نے پہلے خط کے کئی مسودے پھاڑنے کے بعد ایک آخری عشق و محبت میں شراپور، تحریر مکمل کی، جو میں یہاں من و عن نقل کرتا ہوں:-

جان جیل!

اپنے دل کی دھڑکنیں سلام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ حیران نہ ہو جائیے گا کہ کون ہے جو آپ سے یوں بے دھڑک ہم کلام ہے۔ میں عرض کئے دیتا ہوں۔ کل شام کو سو اچھ بجے۔ نہیں، چھ بج کر گیارہ منٹ پر جب آپ امرت سینما کے پاس تانگے میں سے اتریں تو میں نے آپ کو دیکھا۔ بس ایک ہی نظر میں آپ نے مجھے مسحور کر لیا۔

آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکڑ دیکھنے چلی گئیں اور میں باہر کھڑا آپ کو اپنی تصویر کی

آنکھوں سے مختلف روپوں میں دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد آپ باہر نکلیں۔ پھر زیارتِ نصیب ہوئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کا غلام ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو اور کیا لکھوں۔ بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ میری محبت کو اپنے حسن و جمال کے شایانِ شان سمجھیں گی یا نہیں۔
اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں خودکشی نہیں کروں گا، زندہ رہوں گا تا کہ آپ کے دیدار ہوتے رہیں۔

آپ کے حسن و جمال کا پرستار
جیل

یہ خط اس نے میرے گھر میں ایک خوشبودار کاغذ پر اپنی رفِ تحریر سے منتقل کیا تھا۔ لفافہ پھول دار اور خوشبودار تھا جس کو جمالیاتی ذوق نے پسند نہیں کیا تھا۔
چند روز کے بعد جیل مجھ سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ خط اس لڑکی تک نہیں پہنچایا۔
اولاً اس لئے کہ عشق کا آغاز خط سے کرنا مناسب ہے۔
ثانیاً اس لئے کہ اس خط کی تحریر بے ربط اور بے اثر ہے۔ اس نے خود کو لڑکی تصور کر کے یہ خط پڑھا اور اس کو بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا۔

ثالثاً اس لئے کہ تقیث کرنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ لڑکی ہندو ہے۔
یہ مرحلہ بھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ مجھ سے کوئی پردہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے پڑھائی یا کپ بازیوں میں مشغول رہتے۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی۔ ان سے بڑی بچکانہ قسم کی پر لطف باتیں ہوتیں۔ اس کی موسیٰ کی ایک انتہا درجے کی سادہ لوح لڑکی عذرا تھی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس ہوگی۔ اس کا ہم دونوں بہت مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جیل کی جب دوسری کوشش بھی بار آور ثابت نہ ہوئی تو وہ دو مہینے تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس نے عشق میں گرفتار ہونے کی کوئی نئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے بعد اس کو ایک دم دورہ پڑا اور اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ چھ لڑکیاں اپنی عشق کی بندوق کے لئے نشانے کے طور پر منتخب کر لیں۔ پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ صرف چار لڑکیوں کے متعلق مجھے اس کی عشقِ مہم کے بارے میں علم ہے۔

پہلی نے جو اس کی دورِ راز کی رشتے دار تھی، اپنی ماں کے ذریعے اس کی ماں تک یہ

اپنی بیگم بھوادیہ کا اگر جیل نے اس کو پھر بری نظروں سے دیکھا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

دوسری، غور سے دیکھنے پر چپک کے داغوں والی نکلی۔

تیسری کی چھٹے ساتویں روز ایک قصائی سے منگنی ہو گئی۔

چوتھی کو اس نے ایک لمبا عشقیہ خط لکھا جو اس کی موسیٰ کی بیٹی عذرا کے ہاتھ آ گیا۔ معلوم نہیں کس طرح۔ پہلے جمیل اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا، اب اس نے اڑانا شروع کر دیا۔ اتنا کہ جمیل کا ناک میں دم آ گیا۔

جیل نے مجھے بتایا: ”سعادت یہ عذرا جسے ہم بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح سمجھتے ہیں، سخت ظالم ہے۔ سب سمجھتی ہے۔ جس لڑکی کو میں نے خط لکھا تھا اور غلطی سے اپنے میز کے دراز میں رکھ کر یہ سوچنے میں مشغول تھا کہ وہ اس کا کیا جواب لکھے گی، یہ کم بخت جانے کیسے لے اڑی۔ اب اس نے میرا نقطہ بند کر دیا ہے۔ بعض اوقات ایسی تلخ باتیں کرتی ہے کہ مجھے رلاتی ہے اور خود بھی روتی ہے۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔“

اس سے بہت زیادہ تنگ آ کر اس نے اپنے عشق کی مہم اور تیز کر دی۔ اب کی اس نے چودہ لڑکیاں چنیں مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان میں سے صرف ایک باقی رہ گئی۔ دس اس کے مکان سے بہت دور رہتی تھیں۔ جن کو ہر روز جتنی طور پر دیکھنے کے متعلق اس کا دل گواہی نہیں دیتا تھا۔ دواہی تھیں۔ جن کے خاندانی ہونے کے بارے میں اسے شبہ تھا۔ بارہ ہوئیں۔ تیرہیوں نے ایک دن ایسی بری طرح گھورا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

چودھویں جو کہ چودھویں کا چاند تھی، ملتفت ہو جاتی مگر وہ کم بخت کیونست تھی۔ جمیل نے سوچا تھا کہ اس کا التفات حاصل کرنے کے لئے وہ ضرور کیونست بن جاتا، کھادی کے کپڑے پہن کر مزدوروں کے حق میں دس بارہ تقریریں بھی کر دیتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے والد صاحب ریٹائرڈ انجینئر تھے ان کی پشٹن یقیناً بند ہو جاتی۔ یہاں سے ناامیدی ہوئی تو اس نے سوچا کہ عشق بازی فضول ہے، شرافت یہی ہے کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ اس کے بعد اگر طبیعت چاہے تو اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی امی جان اور اپنے بابا جان سے بات کرے۔

بہت دنوں کی سوچ، پجار کے بعد اس نے اس گفتگو کا مسودہ تیار کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی۔ وہ خوش ہوئیں۔ ادھر ادھر اپنے عزیزوں میں انہوں نے جمیل کے لئے سوزوں رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ پڑوس میں خان بہادر صاحب کی

لڑکی تھی۔ ایم اے۔ بڑی ذہین اور طبیعت کی بہت اچھی۔ مگر اس کی ناک چھٹی تھی۔ خالہ کی بیٹی حسن آراتھی پر بے حد کالی۔ صغریٰ تھی مگر اس کے والدین بڑے خفیس تھے۔

جہیز میں جتنے جوڑے جمیل کی ماں چاہتی تھی، اس سے وہ آدھے بھی دینے پر رضامند نہیں تھے۔ عذرا کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جمیل کی ماں نے بڑی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے ایک معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے بات چیت طے کر لی۔ جمیل اپنی ناکام عشق بازیوں سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ بھی نہ پوچھا کہ شکل صورت کی کیسی ہے۔ ویسے اس نے اپنے زندہ تصور میں اس کا اندازہ لگالیا تھا اور مفصل طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہوگا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا میں خوش تھا کہ جمیل کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کے مرض متعلقہ بہ عشق کا ایک فقط یہی۔ علاج تھا۔

چھ مہینے گزر گئے۔ آخر راولپنڈی کے اس معزز اور متمول خاندان کی لڑکی سے جس کا نام غالباً شریفہ تھا، اس کی منگنی ہو گئی۔

اس تقریب پر اسے سسرال کی طرف سے ہیرے کی انگوٹھی ملی جو وہ ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ اس پر اس نے ایک لٹرم بھی لکھی جس کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔ ایک برس تک سوچتا رہا کہ اسے اپنی دلہن کو کب اپنے یہاں لانا چاہئے۔ آدی چونکہ آزاد اور روشن خیال قسم کا تھا اس لئے اس کی خواہش تھی کہ ماں باپ سے علیحدہ اپنا گھر بنائے۔ یہ کیسا ہونا چاہئے اس میں کس ڈیزائن کا فرنیچر ہو، نوکر کتنے ہوں، ماہوار خرچ کتنا ہوگا، ساس کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوگا، ان تمام امور کے بارے میں اس نے کافی سوچ بچار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی والے تنگ آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتی کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو۔

جمیل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کی امی نے تاریخ مقرر کر دی۔ کارڈ وارڈ چھپ گئے۔ ویسے کی دعوت کے لئے ضروری سامان کا بندوبست کر لیا گیا۔ اس کے والد بزرگوار شیخ محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ انجینئر بہت مسرور تھے مگر جمیل بہت پریشان تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنے بننے والے گھر کا آخری نقشہ تیار نہیں کر سکا تھا۔

رخصتی کی تاریخ ۱۹ اکتوبر مقرر کی گئی تھی۔ ۸ اکتوبر کی شام کو بہت دیر تک۔ میرا خیال ہے رات کے دو بجے تک اس آنے والے حادثے کے متعلق تبادلہ خیال کرتے رہے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچے۔ آخر طے یہ ہوا کہ جو ہوتا ہے، ہو نے دیا جائے۔

اور ہوا یہ کہ ۱۹ اکتوبر کی صبح کو — منہ اندھیرے جیل میرے پاس سخت اضطراب اور کرب کے عالم میں آیا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی موسیٰ کی لڑکی عذرا نے جو بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح تھی، خودکشی کر لی ہے، اس لئے کہ اس کو جیل سے والہانہ عشق تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے محبوب و معبود کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو۔ اس ضمن میں اس نے جیل کے نام ایک خط لکھا جس کی عبارت بہت دردناک تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر یادگار کے طور پر اس کے پاس محفوظ ہوگی۔



عقل داڑھ

”آپ منہ بجائے کیوں بیٹھے ہیں؟“

”بھئی دانت میں درد ہو رہا ہے..... تم تو خواہ مخواہ.....“

”خواہ مخواہ کیا..... آپ کے دانت میں کبھی درد ہو ہی نہیں سکتا۔“

”وہ کیسے؟“

”آپ بھول کیوں جاتے ہیں کہ آپ کے دانت مصنوعی ہیں..... جو اصلی تھے، وہ تو

کبھی کے رخصت ہو چکے ہیں۔“

”لیکن بیگم، بھولتی تم ہو..... میرے تیس دانتوں میں صرف نو دانت مصنوعی ہیں، باقی

اصلی اور میرے اپنے ہیں اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو میرا منہ کھول کر اچھی طرح معائنہ

کر لو۔“

”مجھے یقین آگیا..... آپ کی ہر بات پر مجھے یقین آ جاتا ہے..... پرسوں آپ نے مجھے

یقین دلایا تھا کہ آپ سینما نہیں گئے تھے اور میں مان گئی تھی..... پر آپ کے کوٹ کی جیب میں ٹکٹ

پڑا تھا۔“

”وہ کسی اور دن کا ہوگا، میرا مطلب ہے، آج سے کوئی دوڑ حالی مینے پہلے کا، جب میں

کسی دوست کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا..... ورنہ تم جانتی ہو، مجھے قلموں سے کوئی دلچسپی نہیں

..... تم تو خیر ہر قلم دیکھتی ہو۔“

”خاک..... مجھے فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔“

”فرمت ہی فرمت ہے..... بچیوں کو صبح اسکول بھیج دیا..... پھر سارا دن تم کیا کرتی ہو..... نوکران کو اسکول سے لے آتا ہے۔ کھانا کھلا دیتا ہے..... تم یا تو اپنی کسی سہیلی یا رشتے دار کے ہاں چلی جاتی ہو، یا مٹنی شو دیکھنے..... شام کو پھر دورہ پڑتا ہے اور تم چلی جاتی ہو پھر کوئی اور فلم دیکھنے۔“

”یہ سفید جھوٹ ہے۔“

”یہ سفید ہے نہ کالا، حقیقت ہے۔“

”آپ کے دانت کا درد بھی کیا حقیقت ہے،..... چٹاخ پٹاخ باتیں کر رہے ہیں۔“

”سب سے بڑا درد تو تم ہو..... اس کے سامنے دانت کا درد کیا حقیقت رکھتا ہے۔“

”تو آپ نے جس طرح اپنے دانت نکلوائے تھے، اسی طرح مجھے بھی نکال باہر پھینکیے۔“

”مجھ میں اتنی ہمت نہیں..... اس کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔“

”آپ جرأت کی بات نہ کریں..... آپ کو مفت میں ایک نوکرانی مل گئی ہے، جو دن رات آپ کی خدمت کرتی ہے..... اسے آپ برطرف کیسے کر سکتے ہیں۔“

”غضب خدا کا..... تم نے دن رات میری کب خدمت کی ہے..... پچھلے مہینے، مجھے جب نمونیا ہو گیا تھا تو تم مجھے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر سیال کوٹ چلی گئی تھیں۔“

”وہ تو بالکل جدا بات ہے۔“

”جدا بات کیا ہے؟“

”مجھے، آپ کو معلوم ہے، اپنی عزیز ترین سہیلی نے بلایا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہو رہی تھی۔“

”اور یہاں جو میری بربادی ہو رہی تھی۔“

”آپ اچھے بھلے تھے..... میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا..... اس نے میری تھقی کر دی تھی..... اس نے کہا تھا: ”تھو لیس کی کوئی ضرورت نہیں..... نمونیا کا ایک کوئی اتا سیریس نہیں۔ پھر پینسلین کے ٹیکے دیئے جا رہے ہیں..... انشاء اللہ دو ایک روز میں تندرست ہو جائیں گے۔“

”تم سیال کوٹ میں کتنے دن رہیں؟“

”یہی کوئی دس پندرہ دن“

”اس دوران میں تم نے مجھے کوئی خط لکھا، میری خیریت کے متعلق پوچھا؟“

”اتنی فرمت ہی نہیں تھی کہ آپ کو ایک سطر بھی لکھ سکتی۔“

”لیکن تم نے اپنی والدہ مکڑ مکڑ کو چار خط لکھے!“

”وہ تو بہت ضروری تھے۔“

”میں نے سب پڑھے ہیں۔“

”آپ نے کیوں پڑھے..... یہ تو بہت بڑی بدتمیزی ہے۔“

”بدتمیزی میں نے نہیں کی..... تمہاری والدہ مکرّمہ نے مجھے خود ان کو پڑھنے کے لئے کہا، اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر ضروری تھے۔“

”کیا ضروری نہ تھے؟“

”بہت ضروری تھے، اس لئے کہ خاوند کے پھیمروں کے مقابلے میں دلہن کے جہیز کی تفصیلات بہت اہم تھیں..... اس کے بالوں کی افشاں، اس کے گالوں پر لگایا گیا غاڑہ، اس کے ہونٹوں کی سرخی، اس کی زریفت کی قمیض اور جانے کیا کیا..... یہ تمام اطلاعیں پہنچانا واقعی اشد ضروری تھا، ورنہ دنیا کے تمام کاروبار رک جاتے، چاند اور سورج کی گردش بند ہو جاتی..... دلہن کے گھونگھٹ کے متعلق اگر تم نہ لکھتیں کہ کس طرح بار بار جھجھلا کر وہ اسے اٹھا دیتی تھی تو میرا خیال ہے، یہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھونگھٹ بن جاتی۔“

”آج آپ بہت بھونڈی شاعری کر رہے ہیں۔“

”بجائے..... تمہاری موجودگی میں اگر غالب مرحوم بھی ہوتے تو وہ اسی قسم کی شاعری

کرتے۔“

”آپ میری تو بین کر رہے ہیں۔“

”تم ہالش کر دو، مقدمہ دائر کر دو۔“

”میں ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”تو پھر کن چکروں میں پڑنا چاہتی ہو، یہ تو بتا دو۔“

”آپ سے جو میری شادی ہوئی، بھلا اس سے بڑا چکر اور کیا ہو سکتا ہے..... میرے بس

میں ہو تو میں اس سے نکل بھاگوں۔“

”تمہارے بس میں کیا کچھ نہیں..... تم چاہو تو آج ہی اس چکر سے نکل سکتی ہو۔“

”کیسے؟“

”یہ مجھے معلوم نہیں..... تم ماشاء اللہ عقل مند ہو..... کوئی نہ کوئی راستہ نکال لو، تاکہ یہ

روز روز کی بک اور جھک جھک ختم ہو۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود یہ چاہتے ہیں کہ مجھے نکال باہر کریں۔“

”لا حول ولا..... میں خود ماہر جاننے کے لئے تیار ہوں۔“

”کہاں رہیں گے آپ؟“

”کہیں بھی رہوں..... کسی دوست کے ہاں کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا، یا شاید کسی ہوٹل میں چلا جاؤں..... اکیلی جان ہوگی..... میں تو بھی فٹ پاتھ پر بھی سو کر گزارہ کر سکتا ہوں..... کپڑے اپنے ساتھ لے جاؤں گا..... ان کو کسی لائڈری کے حوالے کر دوں گا۔ وہاں وہ اس گھر کے مقابلے میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ شیشے کی الماریوں میں بچے رہیں گے..... جب گئے، ایک سوٹ نکلوا یا، اس کی دھلائی یا ڈرائی کلیٹنگ کے پیسے ادا کیے اور خراماں خراماں.....“

”خراماں خراماں، کہاں گئے؟“

”کہیں بھی..... لارنس گارڈن ہے، سینما ہیں، ریسٹوران ہیں۔ بس جہاں جی چاہا، چلے گئے..... کوئی پابندی تو نہیں ہوگی اس وقت۔“

”یہاں میں نے آپ پر کون سی پابندیاں عاید کر رکھی ہیں..... کھلے بندوں جو چاہے، کرتے ہیں..... میں نے آپ کو کبھی ٹوکا ہے؟“

”ٹوکا تو نہیں ہے..... لیکن میرا ہر بار ایسا جھکا کیا ہے کہ مہینوں طبیعت صاف رہی۔“

”اگر طبیعت صاف رہے تو اس میں کیا قباحت ہے..... طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے۔“

”مانتا ہوں کہ طبیعت ہمیشہ صاف رہنی چاہیے، مگر طبیعت صاف کرنے والے کو اتنا

خیال ضرور مد نظر رکھنا چاہیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ صاف نہ ہو جائے۔“

”آپ کے دانت میں درد دور ہوا تھا؟“

”وہ درد اب دل میں چلا گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”آپ کی گفتگو ہر قسم کے کرشمے کر سکتی ہے..... داڑھ میں شدت کا درد تھا، لیکن آپ خدا

معلوم کیوں تشریف لے آئیں اور مجھ سے لڑنا شروع کر دیا کہ داڑھ کا درد، دل میں منتقل ہو گیا۔“

”میں صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ آپ کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے..... بس اتنی سی بات کا

آپ نے بھگڑ بنا دیا..... میری کچھ میں نہیں آتا آپ کس کھوپڑی کے انسان ہیں۔“

”کھوپڑی تو میری ویسی ہی ہے، جیسے تمہاری یا دوسرے انسانوں کی..... تمہیں اس

میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔“

”فرق، ساخت کے متعلق کچھ محسوس نہیں ہوتا، لیکن میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ

”آپ کی کھوپڑی میں یقیناً کوئی ترس ہے۔“
”کس قسم کا؟“

”اب میں قسم کہاں بتا سکتی ہوں..... کسی ڈاکٹر سے پوچھئے۔“
”پوچھ لوں گا..... لیکن اب میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔“
”یہ سب جھوٹ ہے..... آپ کا دل بہت مضبوط ہے۔“
”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”آج سے دو برس پہلے جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تھے، تو آپ کا ایکس رے
لیا گیا تھا.....“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا..... مجھے آپ کوئی نرس سمجھ بیٹھے تھے اور عجیب عجیب
باتیں کرنے لگے تھے۔“

”بیماری میں کی گئی ہر خطا معاف کر دینی چاہیئے..... تم کہتی ہو کہ مجھے ہوش ہی کہاں تھا تو
بتاؤ، میں صحیح باتیں کیسے کر سکتا تھا۔“

”میں آپ کے دل کے متعلق کہہ رہی تھی..... ہسپتال میں جب آپ کے پانچ چھ ایکسرے
لئے گئے تو سب ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ شخص صرف اپنے مضبوط دل کی وجہ سے جی رہا ہے
..... اس کے گردے کمزور ہیں، اس کی انتڑیوں میں درد ہے، اس کا جگر خراب ہے، لیکن.....“
”لیکن کیا؟“

”انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ نہیں مرے گا، اس لئے کہ اس کے پیچھے درد اور دل صحیح
حالت میں ہیں۔“

”دل میں تو خیر تم بے رہتی ہو..... پیچھے دردوں میں، معلوم نہیں، کون رہتا ہے؟“
”رہتی ہوگی آپ کی کوئی.....“
”کون؟“

”میں کیا جانوں؟“

”خدا کی قسم، تمہارے سوا میں نے کسی اور عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہے۔“
”آنکھ جھکا کر دیکھا ہوگا۔“

”وہ تو خیر دیکھنا ہی پڑتا ہے، مگر کسی برے خیال سے نہیں..... بس ایک انظر دیکھا اور

چل دیے۔“

”لیکن ایک نظر دیکھنا کیا بہت ضروری ہے..... کیا شریعت میں لکھا ہے؟“

”اس بچہ کو چورو..... مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کہنے کیا آئی تھیں..... تمہاری عادت

ہے کہ پہلا مطلب بیان کرنے سے پہلے تم جھگڑا ضرور شروع کر دیا کرتی ہو۔“

”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا تھا۔“

”تو پھر آپ تشریف لے جائیے..... مجھے دفتر کے چند کام کرنے ہیں۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”تو پھر تم خاموش بیٹھی رہو..... میں کام ختم کر لوں تو تمہیں جو اول جلول بکنا ہے، بک

لیتا..... میری داڑھ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔“

”میں کس لئے آپ کے پاس.....“

”مجھے کیا معلوم؟“

”میری عقل داڑھ نکل رہی ہے.....“

”خدا کا شکر ہے..... تم کو اب کچھ عقل تو آجائے گی۔“

”بہت درد ہو رہا ہے.....“

”کوئی بات نہیں..... اس درد ہی سے عقل آرہی ہے۔“

☆☆

عورت ذات

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔

مہاراجہ گ کورس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کر کے اس کو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوق انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لئے مہاراجہ کے پاس گیا تو وہ ڈارک روم میں قلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوایا۔ سسٹین ملی میٹر فلم تھی جو مہاراجہ نے خود اپنے کمرے سے عکس بند کی تھی۔ جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے پر دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں دن آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے۔ سوئز لینڈ! بیبرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادی کشمیر۔۔۔ اشوک بہت محظوظ ہوا۔ یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھیں۔ اشوک کے پاس بھی سسٹین ملی میٹر کمرہ اور پروجیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں،

اتنا ذخیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔

مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھتار مار کر کہا۔۔۔۔۔ ”اور سناؤ دوست“

اشوک نے سگریٹ سلگایا۔ ”مزا آگیا فلم دیکھ کر۔“

”اور دکھاؤں“

”نہیں نہیں!“

”نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔۔۔۔۔ مزا آجائے گا تمہیں۔“ یہ کہہ کر مہاراجہ نے ایک

صندوتچہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی۔ ”ذرا طمینان سے دیکھنا۔“

اشوک نے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ ”مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا“ یہ کہہ

کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔

پردے پر چند لمبے سفید روشنی تھر تھرتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہو گئیں۔

ایک الف تنگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسری سنگار میز کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔

اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔۔۔ اس کے بعد ایک دم اس کے حلق سے عجیب

وغریب آواز نکلی مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا ”کیا ہوا؟“

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی۔ ”بند کرو یا بند کرو۔“

”کیا بند کرو؟“

اشوک اٹھنے لگا مگر مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بیٹھا دیا۔۔۔۔۔ ”یہ فلم تمہیں پورے کا پورا

دیکھنا پڑے گا۔“

فلم چلتا رہا۔ پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی۔ مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادر زاد

عریانی کے ساتھ تھرکتا رہا۔ اشوک نے سارا وقت بے چینی میں کاٹا۔ جب فلم بند ہوا اور پردے پر

صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا پروجیکٹر کی بجائے اس کی

آنکھیں پھینک رہی ہیں۔

مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون لی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ

لگایا۔۔۔۔۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی ہونے کے باعث اس کی آنکھیں پھینچی ہوئی

”کیا؟“

”ایک دوروز کے لئے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے؟“

”ہاں ہاں لے جاؤ!“ یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا۔

”سارے کس کو دکھائے گا؟“

”دوستوں کو“

”دکھا جس کو بھی تیری مرضی!“ یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے پروجیکٹر سے فلم کا اسپول نکالا۔

اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔

”لے پکڑو۔۔۔ عیش کر!“

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑوں

کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔

گھر سے پروجیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا۔ تقریباً سب کے لئے

انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کا رد عمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سے

گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا، بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض

آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام وکمال طور نہ دیکھ سکے ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا۔ کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں۔

چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ دروازے بند کئے۔

پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ کیا۔۔۔ فلم نکالا۔ اس کو فٹ کیا کرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھر تھرائی، پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک کی بیوی

زور سے چیخی، تڑپی، اچھلی اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے اسے پکڑ کر

بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور چیخنا شروع کر دیا۔۔۔ ”بند کرو۔۔۔ بند کرو۔“

اشوک نے ہنس کر کہا۔ ”ارے بھی دیکھ لو۔۔۔ شرماتی کیوں ہو“

”نہیں نہیں“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔

اشوک نے اس کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا ایک طرف کھینچا۔ اس

کھینچنا تانی میں دفعتاً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اشوک کے بریک سی لگ گئی۔ اس نے

تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔

روٹی اور بڑبڑاتی اس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اشوک چند لمحات بالکل خالی

الذہن بیٹانگی تصویریں دیکھتا رہا، جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں۔ پھر ایک دم اس نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا۔۔۔۔۔ دوستوں کو دکھایا تھا۔۔۔۔۔ ٹھیک تھا۔۔۔۔۔ گھر میں اور کسی کو نہیں، اپنی بیوی۔۔۔۔۔ اپنی بیوی کو..... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فلم چل رہا تھا۔ مادرِ زاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی۔ اشوک نے اٹھ کر سوچ اوف کر دیا۔ پردے پر سب کچھ بچھ گیا۔ مگر اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کا دل و دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا۔۔۔۔۔ نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس نے احساسِ ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہوئی تو بچ بچا ہو گیا اور ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اس کے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔

بار بار اسے یہ چیز ستار ہی تھی۔ ”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ.....“ پھر وہ سوچا۔ ”بات اگر ساس تک پہنچ گئی، سالیوں کو پتہ چل گیا۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے یہ لوگ کدایے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا۔۔۔۔۔ ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو.....“

تک آ کر اشوک نے سگریٹ سلگایا۔ وہ نگلی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان، جس نے زندگی میں پہلی بار غفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو، سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا۔ ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جا کر مناسب اور موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگے۔ مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ دیر تک جاگتا رہا۔ آخر سو گیا۔

صبح سویرے اٹھا۔ رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اشوک نے بیوی سے

ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کئے بغیر نکل گیا۔

آفس میں اس دن دل لگا کر اس نے کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل و دماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ ”ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔“

کئی بار اس نے گھربوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہند سے گھما کر ریسور رکھ دیا۔ دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا تو اس نے نوکر سے پوچھا ”میم صاحب نے کھانا کھالیا؟“

نوکر نے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔“۔۔۔۔۔ وہ کہیں باہر گئے ہیں۔“

”کہاں؟“

”معلوم نہیں صاحب!“

”کب گئے تھے!“

”گیارہ بجے۔“

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھالیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ ”گیارہ بجے ابھی تک لوٹی نہیں۔۔۔۔۔ گئی کہاں ہے۔۔۔۔۔ ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب کچھ بتا دے گی؟۔۔۔۔۔ ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے بہنوں کے پاس گئی ہو۔۔۔۔۔ سنیں گی تو کیا کہیں گی؟۔۔۔۔۔ دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں۔ جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی۔۔۔۔۔“ ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔۔۔۔۔“

اشوک آفس سے باہر نکل گیا۔ موٹر لی اور ادھر ادھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رخ گھر کی طرف پھیر دیا۔ ”دیکھا جائے گا جو کچھ ہوگا۔“

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آ گیا۔

لفٹ تیسری منزل پر رکی۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ جائے۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لئے باہر نکلا۔ اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپالی اور سلام کیا۔ اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا۔

نوکر پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔ ”میم صاحب کہاں ہیں۔“

نوکر نے جواب دیا۔ ”اندر کمرے میں!“
 ”اور کون ہے؟“

”ان کی بہنیں صاحب — کولا بے والے صاحب کی میم صاحب اور دوپارسی بایاں!“
 یہ سن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکا دیا۔ اندر
 سے اشوک کی بیوی کی پتی مکر تیز آواز آئی۔ ”کون ہے؟“
 نوکر بولا۔ ”صاحب“

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چینی بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹنیاں کھلنے
 کی آوازیں آئیں۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوک کوری دوڑے ہوتا پچھلے دروازے سے
 کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا ہے اور پردے پر دن کی روشنی میں دھندلی
 دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز میکانیکی آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔
 اشوک بے تحاشا ہنسنے لگا۔

(۴ جون ۱۹۵۰ء)



غالب، چودھویں اور حشمت خاں

مرزا غالب آگرہ سے دہلی چلے آتے ہیں۔ یہ سن اٹھارہ سوسترہ یا اٹھارہ سو اٹھارہ کا ذکر ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس میں مومن، ذوق، شیفتہ، آزرده اور غالب کے علاوہ اس زمانے کے اور شعراء بھی شریک تھے۔

آزرده صاحب نے تحت اللفظ میں اپنی تازہ غزل پڑھی جسے اس شعر پر اس کو کافی داد دی گئی۔ کہتا ہوں اس سے کچھ نکلتا ہے منہ سے کچھ کہنے کو یوں ہلے گی زبان اور زباں نہیں اس کے بعد اس شعر پر بھی اس کو داد دی گئی۔

آزرده ہونٹ تک نہ ہلے اس کے رو برو مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں پھر مومن نے خوش الحانی سے جب یہ شعر پڑھا تو تحسین و آخرین کے ڈوگرے برسنے لگے بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھانہ دیکھتے اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ مومن نے پوری غزل ابھی ختم نہیں کی تھی کہ داد کے شور و غل میں حاضرین سے کہا۔ ”آپ لوگوں کی عنایت ہی تو ہماری محنت کا صلہ ہے۔“ میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں نہیں طالب زر کچھ تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا شیفتہ اونچی آواز میں پکارے۔

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں اس کے بعد ذوق کے سامنے شمع آئی۔ ان کے اس شعر پر بہت داد دی گئی۔

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق و گر نہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

سب سے آخر عالم آئے اور حاضرین سے کہا۔ ”لیجئے حضرات! میں بھی ایک بھیرویں الاپتا ہوں۔“

شوق ہر رنگ رقیب سرد اماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
”شیفتہ نے بے اختیار کہا۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ!“

عالم نے پھر یہ شعر سنایا۔

بوئے گل نالہ دل، دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
صرف شیفتہ اور آرزوہ تھے جنہوں نے عالم کے کلام کی داد دی۔ ذوق چونکہ استاد شاہ تھے، اسی لئے ان ہی کے کلام کو سراہا گیا۔ عالم چنانچہ افسردہ دل شاعرے سے اٹھ گئے، اپنے ہوادار میں بیٹھے اور گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ پچھلی رات کا وقت تھا۔ موسم میں خشکی تھی، ایک موٹڑے کے ان کے کانوں میں کسی عورت کے گانے کی آواز آئی۔

میں بلاتا تو ہوں ان کو گمراہ جذبہ عشق ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
مرزا نوشہ نے کہا روں کو حکم دیا کہ ہوادار روک لو۔ ہوادار روکا۔ عالم اترے۔ آہستہ آہستہ اس گھر کا رخ کیا، جہاں سے آواز آرہی تھی جو غزل گائی جا رہی تھی۔ خود عالم ہی کی تھی۔ جب وہ بیڑھیوں کو طے کر کے اوپر کوٹھے پر پہنچے تو مغنیہ کی آواز سنائی دی۔

میں بلاتی تو ہوں ان کو گمراہ جذبہ عشق ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
عالم کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ جب ان کا یہ شعر ترتیم کے ساتھ گایا جا رہا تھا۔ دلی کی مشہور ڈومنی چودھویں جو سانولے رنگ کی تھی، تانبورہ لئے گاؤں کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے جب عالم کو دیکھا تو کھڑے قد تعظیم دی۔

چودھویں کا چاند روشن تھا۔ عالم کمرے میں داخل ہوئے۔ اب آپ ان کا مکالمہ

سنئے:

چودھویں:- آئیے آئیے تشریف لائیے۔ زہے قسمت کہ آپ ایسے رئیس مجھ ایسی غریب ڈومنی کو سرفراز فرمائیں۔ آپ کے آنے سے گھر روشن ہو گیا۔ آئیے ادھر مسند پر تشریف رکھئے۔

عالم:- (بیٹھ کر، ذرا تامل کے بعد) تمہارا گلا بہت سریلا ہے۔ اور تمہاری آواز میں

ورد ہے۔ جانے کیوں بے کھٹکے یوں اندر چلا آیا..... کیا تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟

چودھویں:- جی مجھے چودھویں کہتے ہیں۔

غالب:- یعنی آج کی رات۔ بھی خوب گاتی ہو۔

چودھویں:- آپ مجھے بتا رہے ہیں۔ میں کس قابل ہوں۔

غالب:- (مسکرا کر) بنائی ترکاری بڑی جاتی ہے۔ تم کو تھوڑے ہی بنایا جاسکتا ہے

چودھویں:- خوب خوب۔ یہ بھی خوب۔ میں بنی بنائی ہوں اللہ نے مجھے بنایا ہے

غالب:- اللہ نے تو سب ہی کو بنایا ہے پر تم بنی (دلہن) ابھی نہیں بنی ہو۔ ذرا پھر وہی

غزل گاؤ۔ نہ معلوم کس کی غزل ہے۔ ہاں ذرا شروع کرو۔

چودھویں:- یہ غزل غالب کی ہے۔ اور غالب کا سمجھنا کوئی سہل نہیں، سمجھے تو کوئی پختہ

کار سمجھے۔ آپ ایسے نوجوان کیا سمجھیں گے۔

غالب:- بھادوتا کے گاؤ تو کچھ بھادو کے انگوں سے شاید سمجھ لوں۔

چودھویں:- بھادو کا بھادو مہنگا پڑے گا۔

غالب:- آج کل تو بازار کا بھادو دن پردن گرتا جا رہا ہے۔ مہنگی سے مہنگی کوڑیوں کے

مول بک رہی ہے۔

چودھویں:- (ایک اداسے) مجھے ضلع جگت نہیں آتا۔ اچھا غزل سنئے:-

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

شع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب:- خوب گاتی ہو، اور یہ غزل تو خاص طور پر خوب گارہی ہو۔ گائے جاؤ۔

چودھویں:- سنئے جناب، یوں تو ذوق، مومن، نصیر، شیفہ سب ہی خوب کہتے ہیں۔ پر

غالب کے کلام میں ایک خاص بات ہے..... آپ کیا سمجھیں گے۔ یہ تو وہی سمجھے جس کو لگی ہو۔

غالب:- کیا میں سن سکتا ہوں، وہ آپ کے دل کی لگی کیا ہے؟

چودھویں:- نہ پوچھئے (سر د آہ بھر کر) کہاں میں ایک غریب ڈومنی، کہاں غالب۔

جانے دیجئے اس بات کو، کچھ اور بات کیجئے۔

غالب:- کہتے تو میں آپ کو غالب کے پاس لے چلوں۔ چودھویں کے چاند کا برج

اسد میں طلوع ہو جائے۔

چودھویں:- مجھ ایسی کو وہ کیا پوچھیں گے۔ اس کا فرنے تو کہا ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غالب:- (مسکرا کر) یوں تو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ پر آپ کو تو غالب کے کلام سے
محبت ہے۔ میرا کلام آپ کو کیا پسند آئے گا۔ اگر کہئے تو دو چار شعر سنا دوں۔
چودھویں:- سنائیے:-

غالب:- (وہی غزل سناتے ہیں جو کہ مشاعرہ میں پڑھ کر آئے تھے):-
شوق ہر رنگ رقیب سر و سماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
(پڑھے پڑھتے رک کر) آپ کو بھلا میرے شعر کیا پسند آئیں گے۔
چودھویں:- نہیں، آپ کے شعر بھی خیر اچھے ہیں۔ وہ بات غالب کے شعروں کی کہاں
غالب:- (روکھے پن سے) جی ہاں، یہ تو بالکل درست ہے۔ اچھا تو اب اجازت
چاہتا ہوں۔ آپ کو بہت تکلیف دی۔

چودھویں:- اچھا پان تو کھاتے جائیے۔ (خاصدان پیش کرتی ہے)
غالب ایک گھوڑی کھا کر خاصدان میں ایک اشرفی رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
غالب جل بھن کر چودھویں کے کوٹھے سے اترتے ہیں۔ تو حشمت خاں، جمعدار سے
(جو آگے چل کر کوٹوال ہو گیا، اور جس نے مرزا کو قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیا) ٹڈ بھڑ ہوئی۔
جمعدار ان سب کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ مرزا انوشہ آپ یہاں کہاں؟ غالب نے اس سے کہا۔
”اماں تجاہل عارفانہ کرتے ہو۔ سب کچھ دیکھ چکے۔“ جمعدار حشمت خاں مسکرایا۔ ”یہ کہئے کہ آپ
کا بھی اس وادی میں کبھی کبھی گزر ہوتا ہے۔“

غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”فقط آج، وہ بھی اتفاق سے۔ معاف کیجئے گا،
جمعدار صاحب۔ خدا حافظ!“

یہ کہہ کر مرزا انوشہ ہوادار میں بیٹھے اور گھر کو روانہ ہو گئے۔ حشمت خاں اوپر کوٹھے پر
چلے گئے۔ چودھویں سے ان کا کچھ معاملہ تھا۔ مگر طے نہیں پاتا تھا۔ چودھویں ان سے پہلا سوال یہ
کرتی ہے۔ میں ان کی گفتگو مکالمے میں پیش کرتا ہوں:-

چودھویں:- کہئے غالب کے اس وقت کے مشاعرے کی غزل لائے۔
جمعدار:- لایا ہوں۔ (لو کاغذ اس کو دیتا ہے) پر غالب تو ابھی ابھی تمہارے کوٹھے سے
اتر کر گئے ہیں۔ یہ ماجرا کیا ہے۔

چودھویں:- (چکر کر) غالب—میرے کو ٹھے پر—ابھی ابھی اتر کر گئے—مجھے دیوانہ بنارہے ہو۔ میرا کوٹھا کہاں، غالب کہاں۔

جمعدار:- واقعی سچ کہتا ہوں۔ وہ غالب خود تھے جو ابھی تمہارے کوٹھے سے اترے ہیں۔ چودھویں:- میری جان قسم غالب تھے—جھوٹ—مجھ کو بنارہے ہو، اللہ، سچ کہو، غالب تھے۔

جمعدار:- ارے تمہاری جان کی قسم یہ غالب تھے۔ یہی مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف مرزا نوشہ تھے جو اسد تخلص کرتے ہیں۔

چودھویں:- ہائے میں مرگئی۔ یہ غالب تھے۔ میرا ستیاناس ہو۔ میں نے ان کی کوئی خاطر مدارات بھی نہ کی۔ (غزل کا کاغذ دیکھ کر) اللہ یہ خواب ہے یا بیداری—سچ ہے۔ وہ تو غالب ہی تھے۔ سو میں غالب ہزار میں غالب۔ جمعدار صاحب سچ کہا آپ نے ضرور وہ غالب تھے۔ ضرور وہ غالب تھے۔ ہائے۔ میں نے تو ان سے کہا، آپ کیا غالب کے کلام کو سمجھیں—میں مر جاؤں..... بھلا وہ کیا دل میں کہتے ہوں گے—ہائے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ اف، نہ معلوم میں کیا کیا ان سے کہہ گئی!

غالب:- دیوان خانے میں داخل ہونے لگے۔ اس وقت صبح صادق ہو چکی تھی۔ اور ان کے خسر نواب الہی بخش صبح کی نماز کو اٹھے تھے۔ ہاتھ میں لوٹا تھا۔ غالب کی ان سے مڈ بھڑ ہو گئی۔ الہی بخش:- کیوں جناب۔ آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟

غالب:- جی مشاعرہ سے آرہا ہوں۔ الہی بخش:- مشاعرہ کل سے ہو رہا تھا اور آج بارہ بجے شب کو ختم ہو گیا۔ اور اب تو پانچ بجنے والے ہیں۔

غالب:- مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کچھ دوستوں سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس لئے دیر ہو گئی۔

الہی بخش:- کیا خوب! نہ معلوم کہاں سے آپ گھومتے گھماتے آرہے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو آپ سیدھے مشاعرے سے تو نہیں آرہے۔

غالب:- جیسا آپ فرما رہے ہیں ایسا ہی ہو گا پہلو بچا کر غالب اندر داخل ہوئے۔ ان کی بیوی نے ان سے کہا۔

ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ انتظار کرتے کرتے دیدے پتھر اگئے۔

اب آتے ہیں، اب آتے ہیں۔ مگر وہ کہاں۔ سلامتی سے صبح ہوتے اب آپ تشریف لائے ہیں۔
بائے اب آئے ہیں تو اندر کیوں نہیں آتے۔

غالب :- (جو تاتا رتے ہوئے) آتا ہوں حضور۔ ذرا جو تاتا رلوں تو گھر میں داخل
ہوں۔ ساری رات تہجد پڑھی گئی ہے۔ کہیں مصلے بچھا ہے۔ کہیں رحل رکھی ہے۔ کہیں وضو کی چوکی
ہے۔ گھر مسجد بنا ہوا ہے۔ میں ہوا شرابی کبابی۔ ایک عابدہ زائدہ بیوی کے گھر میں جوتے سمیت
کس طرح کھس جاؤں؟

امراؤ بیگم :- اب نخرے نہ کیجئے۔ اندر تشریف لائیے (غالب کو کھڑے سوچتے دیکھ
کر) میں کب تک کھڑی رہوں۔ تو آئیے، ورنہ میں رات بھر کی جاگی تھوڑی دیر جا کر مر رہوں۔
غالب :- سر میں آپ کے دشمن۔ لیجئے میں حاضر ہو گیا۔ (گھر میں داخل ہوتے
ہوئے غالب نے کہا) پر مجھ سے آپ کے والد صاحب قبلہ کی روک تھام اور ہر بات کی پوچھ گچھ
نہیں سہی جانی۔ مجھے یہ روک ٹوک بری معلوم ہوتی ہے۔ میں اب الگ مکان میں رہنا چاہتا ہوں۔
کل ہی مجھ سے شاہ نصیر الدین صاحب یعنی میاں کالے صاحب کہہ رہے تھے آپ میری حویلی
میں چلے آئیے۔ آپ سے میں کراہیہ نہیں لینا چاہتا۔ ارادہ ہے کل ہی یہاں سے اٹھ جاؤں، آپ کیا
کہتی ہیں؟

امراؤ بیگم :- مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ بھاڑ پر بھی لے چلیں گے تو چلی چلوں گی۔
ادھر چودھویں کے بالا خانے پر حشمت کا چودھویں سے مکالمہ سنئے :-
حشمت خاں :- چودھویں، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ آج دوڑ حالی برس ہو گئے تم اداس
کی رہتی ہو۔ تم میں وہ شکفتگی نہیں۔
چودھویں :- جنگلی بھلی تو ہوں۔ کھاتی ہوں، پیتی ہوں۔ ہنستی ہوں۔ بولتی ہوں اب
شکفتگی اور کس جانور کا نام ہے۔

حشمت خاں :- جذبات کا وہ دریا جو تمہاری زندگی کے ساتھ ساتھ بہتا ہی رہتا تھا
کھڑے پانی کی طرح ٹھہر گیا ہے۔ آخر اس کی وجہ؟

چودھویں :- خاں صاحب چھوڑیے ان باتوں کو۔ اچھا بتائیے مرزا نوشہ کو ایک بار
آپ کیا میرے گھر میں لا سکتے ہیں۔ اور چاہیں تو آپ ضرور لا سکتے ہیں۔

حشمت خاں :- جب دیکھو تم کمرزا نوشہ کی پڑی رہتی ہے۔ ہونہ ہواس دن کی ملاقات
میں تم نے ان سے کوئی غاص ربط پیدا کر لیا ہے۔ کیوں ہے نا؟

چودھویں :- جی حضرت۔ بات یہ ہے کہ وہ میرے ہاں آئے۔ میں نے ان کو نہ پہچانا اور جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں ان سے کرتی رہی۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ کیسی بدتمیز عورت ہے۔

حشمت خاں :- اچھا تو کیا ہوا، جو سمجھتے ہیں ان کو سمجھنے دو۔ تمہارے لئے یہ عزت کم ہے کہ ایک شہر کے نامی انفر کی تم داشتہ ہو۔

چودھویں :- یہ خوب بات کہی آپ نے کہ کوئی تمہیں بے وقوف بدتمیز سمجھتا ہے تو سمجھنے دو۔ دراصل تو آپ پر لے درجے کے بدگمان واقع ہوئے ہیں۔

حشمت خاں :- یعنی عجب بات ہے کہ دنیا بھر کی فرمائشیں تمہاری پوری کروں روپیہ پانی کی طرح تمہارے یہاں میں بہاؤں اور تم غیروں کی محبت کا دم بھرتی رہو۔ تو مجھے برا معلوم نہ ہو۔ اب تم صاف انکار کرتی ہو تو خیر ہوگا۔

چودھویں :- ابھی ابھی خیر ہوگا۔ ارے میرے تن بدن میں کیڑے پڑیں جو میں نے مرزا نوشہ سے کچھ وہ کیا ہو..... اور جھوٹا الزام لگانے والے کو میں کیا کہوں۔

حشمت خاں :- اچھا بھئی۔ مرزا نوشہ کی اک دعوت کئے دیتا ہوں اور یہ جھگڑا ہی چکا دیتا ہوں۔ ایک بار اور ان کو جی بھر کر دیکھ لو اور یہ قصہ ہی ختم ہو۔

دوسرے ہی روز حشمت خاں نے ایک دعوت ترتیب دی۔ اور مرزا غالب کو بھی مدعو کیا۔ ذرا ان کے مکالمات سنئے :-

غالب :- ہائیں جعدار صاحب۔ یہاں تو سناٹا پڑا ہے۔ ابھی کوئی نہیں آیا۔

حشمت خاں :- یوں کیوں نہیں کہتے کہ اندھیرا پڑا ہے۔ چودھویں آئے تو ابھی چاندنی چھٹک جائے۔

غالب :- سچ تو یوں ہے کہ آپ کے گھر میں چودھویں ہی کے دم سے روشنی ہے۔ جھگڑائیوں کی جھنکار اور آپ کی تیز گفتار کے سوا یہاں دھرا ہی کیا ہے۔

حشمت خاں :- کیا خوب۔ اچھی شاعری رہی۔ اے لیجئے۔ وہ دو تین اور احباب جن کو میں نے مدعو کیا تھا آگئے۔ آئیے جناب جمیل احمد خاں صاحب آئیے اور ابھی سرور خاں تم نے تو بہت دیر کر دی۔

منے خاں!

منے خاں :- جی سرکار! کیا حکم ہے؟

حشمت خاں:- بھئی چودھویں ابھی تک نہیں آئیں۔ کیا وجہ؟
منے خاں:- جی بہت دیر سے آئی، لال کمرے میں بیٹھی ہیں، سماجی بھی سارے حاضر ہیں۔

حشمت خاں:- تو بیڑا دے دو۔ محفل میں آجائیں۔ گانا شروع ہو۔ منے خاں دوسرے کمرے میں گئے اور بی چودھویں کو بیڑا دیا۔ چودھویں مع اپنے ساتھیوں کے محفل میں آکھڑی ہوئیں۔ طلبہ سارنگی سے ملنے لگا بلہا بننے لگا، اور بی چودھویں نے ناچنا شروع کیا۔
جمیل احمد:- (داد دیتے ہوئے) بی چودھویں کیا کیا ناچ کے انگوں میں بھاؤ بنا رہی ہو۔
چودھویں:- (توڑے لے کر تسلیم بجالاتے ہوئے) آپ رئیس لوگ قدردانی فرماتے ہیں ورنہ میں ناچنا کیا جانوں۔

سرور خاں:- سچ تو یہ ہے، بی چودھویں، تم ناچتی ہو تو معلوم ہوتا ہے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔

جمیل احمد:- اماں گل ریز نہیں کہتے (غالب کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں مرزا نوشہ صاحب صحیح عرض کر رہا ہوں نا۔

غالب:- میں تو نہ پھلجھڑی کہوں گا اور نہ گل ریز۔ بلکہ یوں کہوں گا کہ معلوم ہوتا ہے مہتاب چھوٹ رہی ہے۔

جمیل احمد:- واہ! واہ! کیوں نہ ہو۔ شاعر ہیں نا شاعر۔ چودھویں کا ناچ اور مہتاب۔ نہ پھلجھڑی نہ گل ریز۔ سبحان۔ سبحان اللہ!

حشمت خاں:- ایک تو یوں ان بی صاحبہ کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے۔ آپ لوگ اور ساتویں آسمان تک پہنچا رہے ہیں۔

چودھویں:- (ناچتے ہوئے ایک ادا سے) جی ہاں آپ کو تو بس کیڑے ڈالنے آتے ہیں۔

حشمت خاں:- اچھا حضرات سنئے، بی چودھویں جس وقت ناچتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے پانی پر مچھلی تیر رہی ہے۔ اب خوش ہونئیں۔

چودھویں:- دماغ کہاں پہنچا۔ سڑی بد بودار مچھلی۔ دور پار۔ نوج میں کیا مچھلی ہوں۔
(فرماؤں قہقہہ لگتے ہیں۔ حشمت کو چودھویں کا جواب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اتنے میں چودھویں غالب کی ایک غزل گانا شروع کرتی ہے)

یہ ہم جو بحر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
غالب:- کیا گانا پایا ہے۔ گاتی رہو۔ اسی طرح گاتی رہو۔

حشمت خاں:- (جل بھن کر) ارے ہٹاؤ۔ یہ غزلیں وزلیں۔ کوئی ٹھمری داد را گاؤ۔
(چودھویں غزل گانا بند کر دیتی ہے اور یہ ٹھمری گاتی ہے)
(پیابن نا آوت چین)

حشمت خاں:- (گانے کے دوران میں خدمت گار کو آواز دیتا ہے) جان محمد۔ جان محمد۔ وہ میرا صندوقچہ لانا۔

جان محمد:- کون سا صندوقچہ حضور۔
حشمت خاں:- ارے وہی جس میں کل میں نے تمہارے سامنے زیورات لا کر رکھے ہیں۔

(گانا جاری رہتا ہے۔ اس دوران میں خدمت گار صندوقچہ لا کر جمعدار کے سامنے رکھ دیتا ہے۔) ”یہ لیجئے سرکار صندوقچہ“

حشمت خاں:- (ایک جڑاؤ گلو بند نکال کر) چودھویں! ادھر دیکھو۔ یہ گلو بند کس کا؟
چودھویں:- (ایک ادا کے ساتھ) میرا۔

حشمت خاں:- (جڑاؤ جھالے نکال کر) چودھویں! یہ جھالے کس کے؟
چودھویں:- میرے

حشمت خاں:- (کڑے نکال کر) یہ کڑوں کی جوڑی کس کی؟
چودھویں:- میری۔

حشمت خاں:- اچھا بتاؤ۔ چودھویں کس کی؟

چودھویں:- (رک کر دبی آواز میں ہولے سے) آپ کی۔

حشمت خاں:- (غالب سے) آپ بھی گواہ رہے۔

غالب:- سازش کے مقدمے میں گواہی مجھ سے دلواتے ہو۔

حشمت خاں:- تم نے نہیں سنا؟

غالب:- (اٹھ کر محفل سے جاتے ہوئے) نہ کچھ دیکھا نہ کچھ سنا اور دوسرے مجھی سے

مقدمہ اور مجھی سے گواہی۔ غضب۔ اندھیر۔

غالب کے جانے کے بعد محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ چودھویں سے شمسٹ خان گانا جاری رکھنے کے لئے کہتا ہے۔ وہ گاتی ہے، مگر اکھڑے ہوئے سروں میں۔

محفل سے اٹھ کر غالب اپنے مکان کا رخ کرتے ہیں۔ ہوادار گھر کے پاس رکتا ہے۔ غالب اتر کر دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ مقرر اداس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب:- اناہ: مقرر اداس۔ بھی تم آج بڑے وقت پر آئے۔ میں تم کو آج بلوانے ہی والا تھا۔

مقرر اداس:- جی روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقط دو قسط آپ نے بھجوائے تھے اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے۔ ایک پیسہ آپ نے نہ دیا۔

غالب:- بھی مقرر اداس دینے کو میں سب دے دوں گا۔ گلے گلے پانی دوں گا۔ دو ایک جاکد ادا بھی میری باقی ہیں۔

مقرر اداس:- جی سرکار اس طرح بیو پار ہو چکا۔ نہ اصل میں سے نہ سود میں سے پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نہیں ہوا۔ چھ سو چھپن سود کے ہو گئے ہیں۔

غالب:- لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے۔ اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں۔ پانی دو تو پھل پیدا ہو۔

مقرر اداس:- جی دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے۔ کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر ایک دستاویز کر دیں تو آگے کا نام لیں۔

غالب:- لو ابھی دستاویز لکھ دیتا ہوں۔ پر شرط یہ ہے کہ دو ہزار روپے ابھی ابھی مجھے اور دو۔

مقرر اداس:- اچھا میں اشعام منگواتا ہوں۔ یہی ساتھ لایا ہوں۔ آپ فشی غلام عمر عرضی نویس کو بلا لیں۔ پر سود ہی سوارو پیہ سینکڑہ ہوگا۔

غالب:- لالہ کچھ تو انصاف کرو۔ بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں۔

مقرر اداس:- سرکار بارہ آنے سود پر بارہ برس میں کوئی مہاجن روپے نہ دے گا۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔ اب غالب مقرر اداس سے روپے قرض لے کر زیورات تیار کراتے ہیں۔ اور نوکر کے ہاتھ چودھویں کو زیورات بھیجتے ہیں۔ یہ مکالمہ بھی سنئے۔

چودھویں:- کہو میاں مردھے کہاں۔ سے آئے ہو؟

مداری:- حبش خاں کے پھانگ سے آیا ہوں۔ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب نے یہ توڑا بھیجا ہے۔ کچھ زیور ہیں۔
چودھویں:- اشتیاق سے توڑا لیتی ہے۔ ”مرزا غالب نے بھیجا ہے؟“ لاؤ مجھے دو۔
مداری:- بی بی جی گن کے سنبھال لیجئے اور ایک بات نواب صاحب نے جو کہی ہے وہ سن لیجئے۔

چودھویں:- (خوش ہو کر) کیا کہا ہے۔ وہ بھی کہہ دو۔
مداری:- کہا ہے اپنے جمعہ دار سے کہنا۔ جن مقدموں کا فیصلہ روپیہ پیسہ چڑھا کر بڑی آسانی سے اپنے حق میں ہو جائے ان پر گواہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔
چودھویں:- (پریشان ہو کر کہتی ہے) وہی ہوا جو میں سمجھتی تھی۔ میاں مردھے تم ذرا ٹھہر دو تم میں تم سے کچھ کہوں۔
مداری:- بی بی جی، نواب صاحب نے کہا تھا کہ دیکھو مداری یہ دے آتا۔ واپس نہ لانا۔ اور فوراً چلے آتا۔

چودھویں:- ذرا دم بھر ٹھہرو۔ سنوان سے کہنا۔ میں کیوں کر۔ ہاں یہ کہنا کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ لیکن سناتم نے، کہنا میں مجبوری سے کہہ گئی..... نہیں۔ نہیں۔ مردھے بابا کہنا..... ہاں کیا..... بس یہی کہ میرا قصور کچھ نہیں (آنکھوں میں اس کے آنسو آ جاتے ہیں) لیکن سنامیاں مداری۔ تم اتنا کہنا کہ آپ تشریف لائیں تو میں اپنے دل کا حال کہوں..... اچھا تو یوں ہی کہنا کہ سب زبانی عرض کروں گی..... ہائے کیا کہوں..... سنو میرا ہاتھ جوڑ کر سلام کہنا۔ اور لو یہ دس روپے تمہارا انعام۔

اے میاں مردھے۔ اے میاں مداری۔ کہنا میری جان قسم ضرور آئیے گا۔ کہنا میرا مردہ دیکھئے۔ چودھویں کو اپنے ہاتھ سے گاڑیے گا جو نہ آئے۔ دیکھو ضرور سب کچھ کہنا۔



غسل خانہ

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی بیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے، جس میں کبھی اگلے لکڑیاں اور کوئلے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب اس میں تل لگا کر اس کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنا دیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کے رہ گیا۔

یوں تو میں اس غسل خانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اگلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلی نے اس میں بھیکے ہوئے چوہوں کی شکل کے چار بچے دیئے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مندی رہی تھیں۔ چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر میں نے اسی جان سے کہا تھا۔ ”ای جان میری بلی ٹیڈی نے جب بچے دیئے تھے تو ان کی آنکھیں بند تھیں، اس کی کیوں کھلی ہوئی ہیں۔“

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہوں، لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت

داخل ہوا جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا، ایک بھاری بھر کم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار دوہاواسنگھ پھل فروش کی دکان سے ایک کالی انار چرایا۔ میں اور میرے دوہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دکان سے چرایا کرتے تھے۔ لیکن بھائی دوہاواسنگھ کو، جو پھلوں کے ٹوکروں میں گھر ایک بڑی سی پکڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن انیم کے نشے میں اوجھتا رہتا تھا، خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں نہیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اٹھالے کبھی لوکاٹ کا ایک کچھالے اڑے کبھی مٹھی بھر خوبانیاں اٹھالیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لئے پکڑا گیا۔ ایک دم بھائی دوہاواسنگھ اپنی ابدی نیند سے چونکا اور اتنی پھرتی سے نیچے اتر کر اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے حواس باختہ ہو گئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا لیکن جب میل داڑھی والے سردار دوہاواسنگھ نے اپنی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھ سے میری گردن ناپی تو مجھے احساس ہوا کہ میں چور ہوں۔

بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ سر بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً بھائی دوہاواسنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا۔ اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑا تاناہوا چلا گیا۔ ”وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو سمجھا سستے چھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے ابا جی سردار دوہاواسنگھ نہیں تھے۔ وہ نہ انیم کا نشہ کرتے اور نہ انہیں پھلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کبخت دوہاواسنگھ نے ان سے میری چوری کا ذکر کر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جان سے کہیں گے ”کچھ سنی ہو۔ اب تمہارے اس بر خوردار نے چوری چکاری بھی شروع کر دی ہے۔“ سردار دوہاواسنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب سے کہوں گا کہ آپ کا لڑکا انار اٹھا کے بھاگ گیا تھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ ”میں نے آج تک اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دی۔ لیکن اس نالائق نے میری ساری عزت خاک میں ملا دی ہے۔“

وہ مجھے دو تین طمانچے مار کر مطمئن ہو جاتے مگر امی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔ اس لئے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد (ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغزش ہو اور وہ آنگن میں اپنے گنبے سر کا پسینہ پونچھ کر امی جان کو کوسنا

شروع کر دیں، جیسے سارا تصور ان کا ہے۔

کونے کے بعد بھی ان کا جی ہلکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے اور دیر تک خاموش آنگن میں سینٹ لگے فرش پر ادھر ادھر ٹہلتے رہتے تھے۔

جس وقت بھائی دوہوا اسٹکھ نے وکیل صاحب کا نام لیا میری آنکھوں کے سامنے اباجی کا منجاسر آگیا، جس پر پسینے کی تھھی تھھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پر پسینہ آتا ہے۔

بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پر پیدا ہوا مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ اباجی کا منجاسر، اس پر چمکتی ہوئی پسینے کی تھھی تھھی بوندیں۔ آنگن کا سینٹ لگا فرش، اس پر ان کا غصے میں ادھر ادھر چھیڑے ہوئے بر شیر کی طرح چلنا اور رک رک کر امی جان پر برسنا.....

سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ غسل خانے کے پاس ٹھہر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر اس کجمنت پھل فروش نے سچ بچ اباجی سے کہہ دیا تو آفت ہی آجائے گی اور تین روز کے لئے سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔ اباجی اور سب کچھ معاف کر سکتے تھے لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم بنو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ امی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا۔۔۔۔۔ امی جان نے تو اسے معاف کر دیا تھا لیکن اباجی کو جب اس چوری کا پتا چلا تو انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔ ”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے۔ میں نے اوپر جانے کے لئے زینے پر قدم ہی رکھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ جانے وہ میرے بڑے بھائی ثقلین سے کیا کہہ رہے تھے لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ بنو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس غصے میں یہ کہہ رہے ہیں۔ ”میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا۔“

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ میں اور زیادہ سہم گیا اور اوپر جانے کے بجائے نیچے اتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ اباجی کو میری چوری کا علم نہ ہو۔ یعنی دوہوا اسٹکھ ان سے اس بات کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دعا مانگنے کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا۔

خدا نے میری دعا قبول کی۔ دوہوا اسٹکھ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے۔ لیکن اس نے اباجی سے اتار کی چوری کا ذکر نہیں کیا۔۔۔۔۔ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ بازار میں کھلے بندوں سگریٹ پئے جارہا تھا کہ اباجی کے ایک دوست سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصے میں ایک طرف پھینک دیا اور کہا۔ ”تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا شرم و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں رہا۔ خواجہ صاحب سے کہہ کر آج ہی تمہاری اچھی طرح گوشمالی کراؤں گا۔“

انارکی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سگریٹ پینا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ خواجہ صاحب یعنی میرے اباجی خود سگریٹ پیتے تھے۔ مگر اپنی اولاد کے لئے انہوں نے اس چیز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں سے انہیں سگریٹ کی ڈیپال مل گئی تھی۔ جس پر انہوں نے ایک تھپڑ لگا کر فیصلہ کن لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے ”ثقلین! اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سگریٹ کی ڈیپال دیکھی تو میں تمہیں اسی وقت گھر سے باہر نکال دوں گا۔ سمجھ گئے؟“

ثقلین سمجھ گیا تھا چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک سگریٹ لاتا تھا اور پانچنانے میں جا کر پیا کرتا تھا۔

ثقلین سے میں تین برس چھوٹا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا سگریٹ پینا اور وہ بھی بازاروں میں کھلے بندوں۔۔۔۔۔ اباجی کسی طرح بھی برداشت نہ کرتے۔ ثقلین کو تو انہوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر سے باہر نکال دیتے۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدق دل سے دعاء مانگی کہ اے خدا اباجی کو میرے سگریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو۔ دعاء مانگنے کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور میں اوپر چلا گیا۔

آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر ہی کیوں دعاء مانگتا تھا۔ دعاء کہیں بھی مانگی جاسکتی ہے۔ درست ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اس کے ساتھ اور بہت سی غیر ضروری باتیں خود بخود آجاتی ہیں۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے میں دعاء مانگی تھی۔ مگر میرے دل میں کئی اوٹ پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ دعاء اور یہ باتیں غلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی۔

”اللہ میاں..... میں نے سگریٹ..... بیڑا غرق ایک پوری ڈیپا سگریٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لی تو کیا ہوگا۔۔۔۔۔ کہیں ثقلین ہی نہ لے اڑے۔۔۔۔۔“

اللہ میاں..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پینے میں کیا برائی ہے؟ بابا جی نے ہتھئی جماعت سے پینے شروع کئے تھے..... اللہ میاں..... سگریٹ والے کے ساڑھے تیرہ آنے میری طرف نکلتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کیسے ہوگی اور اسکول میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینے ہیں..... مٹھائی اس کی بالکل واہیات ہے لیکن میں کھاتا کیوں ہوں؟..... اللہ میاں مجھے معاف کر دے..... جو سگریٹ بابا جی پیتے ہیں ان کا مزہ کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پان کھا کر سگریٹ پینے کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔..... اللہ میاں..... اب کے نہر پہ جائیں گے تو سگریٹوں کا ڈبہ ضرور خریدیں گے..... کب تک سگریٹ والا ادھار دیتا جائے گا۔ امی جان کا بوہ..... اللہ میاں مجھے معاف کر دے۔“

میں دل ہی میں خاموش دعاء مانگوں تو یہی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کر کے میں وہاں اپنے خیالات کو آدراہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ میلی چھت کی طرف نگاہیں اٹھائیں، سانس روکا اور ہولے ہولے دعاء گنگنانا شروع کر دی۔ عجیب بات ہے کہ جو دعاء میں نے اس غلیظ غسل خانے میں مانگی، قبول ہوئی اتار کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سگریٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ نہ جان سکے، اس لئے کہ ان کا دوست اس روز شام کو کلکتے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی۔

عُسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران دعاء مانگی اور وہ قبول ہوئی۔ جیومیٹری کا پُرچہ تھا میں نے عُسل خانے میں جا کر پراپوزیشن کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعاء مانگی کہ کسی متحکم کی نظر نہ پڑے اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے پھاڑے ہوئے اوراق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈسک پر رکھ لئے اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔

[illegible]

چند اہم بیچے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ میرے چچا کی شادی تھی آپ سنگاری پور سے اس غرض کے لئے آئے تھے۔ چونکہ ان کا اور ہمارا گھر..... بالکل ساتھ ساتھ ہے

اس لئے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی کہتے، کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آگئے تھے۔ آدھی آدھی رات تک ڈھولک پر گیت گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دہن سے چھیڑ چھاڑ، عجیب و غریب رسمیں، تیل، مہندی اور نامعلوم کیا کیا کچھ۔۔۔ بچوں کی چیخ پکار۔ لہڑا کیوں کی نئی گرگاہیوں اور سینڈلوں میں ایک چلت پھرت۔۔۔۔۔ اوٹ پٹانگ کھیل۔۔۔۔۔ غرض کہ ہر وقت ایک ہنگامہ چار ہوتا تھا۔

جب اس قسم کی خوشگوار انفر اتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھیڑنے کا بہت لطف آتا ہے بلکہ یوں کہنے کی شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھیڑنے کا موقع ملتا ہے۔۔۔۔۔ ہمارے دور کے رشتہ دار شالباں تھے۔ ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آچکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رکی ہوئی ہنسی ہے۔۔۔۔۔ نہیں، میں اپنے مانی الضمیر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکا۔۔۔۔۔ اس کا سارا وجود کھلکھلا کر ہنس اٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھیڑ دیا جاتا۔ بالکل ذرا سالیانی اس کو اگر صرف چھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوارہ بن جاتی۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹوں اور اس کے آنکھوں کے کونوں میں، اس کی ناک کے تھتھے تھتھے نتھنوں میں، اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں، اس کے کان کی لوؤں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے۔۔۔۔۔ میں نے اس کو چھیڑنے کا پورا حہمہ کر لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیڑھیوں کی تختی خراب ہو گئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا گیا، بہر حال اچھا ہوا۔ کیونکہ وہ بار بار کبھی نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ اوپر جاتی یا نیچے آتی مجھ سے اس کی مڈ بھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے میں اس سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر جاتا۔۔۔۔۔ بات معقول تھی۔ چنانچہ میں کچھ دیر دم سادھے اس کا منتظر رہا اور اس دوران اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بناتا رہا۔

کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔۔۔۔۔ کھٹ۔۔۔۔۔ کھٹ۔۔۔۔۔ کھٹ۔۔۔۔۔ میں تیار ہو گیا۔ اباجی تھے۔ انہوں نے پوچھا: ”کون ہے؟“ میں نے کہا: ”جی عباس۔“۔۔۔۔۔ انہوں نے اندھیرے میں ایک زوردار طمانچہ میرے منہ پر مارا اور کہا: ”تمہیں شرم نہیں آتی یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو۔“ ثریا ابھی ابھی اپنی ایک سیٹلی سے تمہاری اس بے ہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔ واہیات کہیں کے!۔۔۔۔۔ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو اپنے بڑوں کی آبروی کا کچھ لحاظ کرو۔۔۔۔۔ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لئے تمہیں مانگا ہے۔۔۔۔۔ لعنت ہو تم پر۔“

کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔۔۔ کسی کے نیچے اترنے کی آواز آئی۔ اباجی نے میرے حیرت زدہ منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑبڑاتے چلے گئے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔۔۔۔۔ ثریا تھی۔۔۔۔۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لچلے کے لئے ٹھٹکی اور حیا آلود غصے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی:

”خبردار جواب آپ نے مجھے چھیڑا۔ امی جان سے کہہ دوں گی۔“

میں اور بھی زیادہ متحیر ہو گیا۔ دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ثقلین باہر نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے تھے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”دعاء مانگ رہا تھا۔“

میں نے پوچھا ”کس لئے“

مسکرا کر اس نے کہا۔ ”ثریا کو میں نے چھیڑا تھا۔“

”میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعاء مانگی جائے ضرور قبول

ہوتی ہے۔“



فرشتہ

سرخ کھر درے کبل میں عطاء اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کھرے کی دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدو خال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور، بہت دور، جہاں شاید یہ کمرہ یا دالان ختم ہو سکتا تھا، ایک بہت بڑا بت تھا جس کا دراز قد چھت کو چھاڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عطاء اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آ رہا تھا جو بہت پر ہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھانے سے قصداً گریز کر رہا ہے۔ عطاء اللہ نے ہونٹ گول کر کے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پر ہیبت بت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی، بالکل اس طرح جس طرح کتے کو بلانے کے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یا دالان کی دھندلی فضا میں ان گنت دیں لہرانے لگیں۔ لہراتے لہراتے یہ سب ایک بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مرتبان فضا میں بغیر کسی سہارے کے تیرتا، ڈولتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈبکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عطاء اللہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا، اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور بے ہوش ہو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کھراغاب

تھا۔ وہ دیوہیکل بت بھی۔ اس کا سارا جسم پینے میں شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا، ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں، بے شمار چیزیں۔ اس کی بیوی اور بچوں کی ہڈیاں چٹ رہی تھیں، مگر اس کے گوشت پوست اور اس کی ہڈیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جھلسا دینے والی پیش میں بھی وہ بخ بستہ تھا۔

اس نے ایک دم اپنے بر فیلے ہاتھوں سے اپنی زرد رو بیوی اور سوکھے کے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور پھینک دیا۔ اب آگ کے اس الاؤ میں عرضیوں کے پلندے کے پلندے جل رہے تھے۔ ہرزبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ سے کیے ہوئے دستخط، سب جل رہے تھے آواز پیدا کئے بغیر۔

آگ کے شعلوں کے پیچھے اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پینے سے — سرد پینے سے ترتر۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلہ بھیکے ہوئے آفتاب کی طرح رونے لگا۔ عطاء اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔

عرضیاں جلتی رہیں اور عطاء اللہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زرد رو بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیئے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئلے بن کر سلگنے لگے۔ انہیں دیکھ کر عطاء اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ چھپکا مار کر اس نے تھال میں سے آخری پیڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ لیکن آنا خشک تھا۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رکنے لگا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا تھا۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود

اولیں پُرسش نماز بود

وہ فوراً پتھر لیے فرشتے پر سجدے میں گر پڑا۔ نماز بخشنا کے لئے دعا مانگنا چاہی مگر بھوک اس کے معدے کو اس بری طرح ڈسنے لگی کہ بلبلاتا اٹھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی بارعب آواز میں پکارا:

”عطاء اللہ!“

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا۔ محرابوں کے پیچھے۔ بہت پیچھے، اونچے منبر پر ایک شخص کھڑا تھا۔ مادر زاد برہنہ، اس کے ہونٹ ساکت تھے مگر آواز آرہی تھی۔

”عطاء اللہ! تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک

اے کوئی سہارا ہو۔ ہمیں بتاؤ، کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو؟۔ تم بیمار ہو۔ تمہاری بیوی آج نہیں توکل بیمار ہو جائے گی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، بیمار ہوتے ہیں۔ زندہ درگور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کو ختم نہیں کیا۔ کیا اس خاتمے کے لئے بھی تمہیں کسی کے سہارے کی ضرورت ہے؟۔ تم رحم و کرم کے طالب ہو۔ بے وقوف! کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لئے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے۔ کس کس کو آئے۔ ایک صرف تم عطاء اللہ نہیں ہو، تم ایسے لاکھوں عطاء اللہ اس بھری دنیا میں موجود ہیں۔ جاؤ اپنی مصیبتوں کا علاج خود کرو۔ دوسریل بچوں اور ایک فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت شرمسار ہو کر خود بخود تمہارے پاس چلی آئے گی۔“

عطاء اللہ غصے سے تھر تھرا کر کانپنے لگا: ”تم۔ تم سب سے بڑے ظالم ہو۔ بتاؤ، تم کون ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کروں، میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔“
مادر زاد برہنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا: ”میں عطاء اللہ ہوں۔ غور سے دیکھو۔ کیا تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے؟“

عطاء اللہ نے اس ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردن جھک گئی۔ وہ خود ہی تھا، بغیر لباس کے۔ اس کا خون کھولنے لگا فرس میں سے اس نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر ایک چٹھر نکالا اور تان کر منبر کی طرف دیکھا۔ اس کا سر چکر ا گیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہو نکل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ پتھر لیے صحن کو عبور کر کے جب باہر نکلا تو ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ ہجوم کا ہر فرد عطاء اللہ تھا۔ جس کا ماتھا لہو لہاں تھا۔

بڑی مشکلوں سے ہجوم کو چیر کر وہ باہر نکلا۔ ایک تنگ دتار یک سرک پر دیر تک چلتا رہا۔ اس کے دونوں کناروں پر حبش اور قزوہ کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں دوسری زہریلی بوٹیاں بھی تھیں۔ عطاء اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر قزوہ کا عرق جمع کیا۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور انہیں ہلاتا ہلاتا اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا۔ شکستہ اینٹوں کا ڈھیر۔

ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے طاق میں مٹی کے تیل کی کھٹی سے کافی روشنی نکل رہی تھی۔ اس نیلی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جھلکنی پلنگری پر اس کے دونوں مریل

بچے مرے پڑے ہیں۔

عطاء اللہ کو بہت ناامیدی ہوئی۔ بوتل جیب میں رکھ کر جب وہ پلنگری کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ پھٹی پرانی گڈڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے، آہستہ آہستہ بل رہی ہے۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا۔ وہ زندہ تھے۔ بوتل جیب سے نکال کر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

دونوں لڑکے تھے۔ ایک چار برس کا، دوسرا پانچ کا۔ دونوں بھوکے تھے۔ دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ گڈڑی ایک طرف ہٹا کر جب عطاء اللہ نے ان کو غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی ہڈیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ ہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹٹولتے ٹٹولتے۔ ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ ہلکی سی تراخ ہوئی اور اس بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاء اللہ خوش ہوا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کام تمام ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا: ”جیناں! جیناں! — ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مار ڈالا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا زینب کہاں ہے؟ — معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ — شاید بچوں کے لئے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو۔ یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے۔ عطاء اللہ ہنس۔ مگر اس کی ہنسی فوراً دب گئی، جب دوسرے بچے نے کروٹ بدلی اور اپنے مردہ بھائی کو بلانا شروع کیا: ”رحیم — رحیم“

وہ نہ بولا تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالیوں میں اس کی آنکھیں چمکیں: ”ابا — تم آگئے۔“

عطاء اللہ نے ہولے سے کہا: ”ہاں کریم، میں آگیا۔“

کریم نے اپنے استخوانی ہاتھ سے رحیم کو جھنجھوڑا: ”اٹھو رحیم — ابا آگئے ہسپتال سے۔“

عطاء اللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: ”خاموش رہو — وہ سو گیا ہے۔“

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا: ”کیسے سو گیا ہے — ہم دونوں نے ابھی تک کچھ

کھایا نہیں۔“

”تم جاگ رہے تھے؟“

”ہاں ابا۔“

”سو جاؤ گے ابھی تم“

”کیسے؟“

”میں سلاتا ہوں تمہیں۔“ یہ کہہ عطاء اللہ نے اپنی سخت انگلیاں کریم کی گردن پر رکھیں اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تراخ کی آواز پیدا نہ ہوئی۔

کریم کو بہت درد ہوا: ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“
 ”کچھ نہیں۔“ عطاء اللہ حیرت زدہ تھا کہ اس کا یہ دوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے۔
 ”کیا تم سونا نہیں چاہتے؟“

کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا: ”سونا چاہتا ہوں۔“ کچھ کھانے کو دے دو۔ سو جاؤں گا۔“

عطاء اللہ نے زہر کی شیشی اٹھائی: ”پہلے یہ دوا کی پی لو۔“
 ”اچھا۔“ کریم نے اپنا منہ کھول دیا۔
 عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا۔ ”اب تم گہری نیند سو جاؤ گے۔“

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ”ابا۔ اب کچھ کھانے کو دو۔“
 عطاء اللہ کو بہت کوفت ہوئی: تم مرتے کیوں نہیں؟“
 کریم یہ سن کر ٹپٹا سا گیا: ”کیا ابا؟“
 تم مرتے کیوں نہیں۔ میرا مطلب ہے، اگر تم مر جاؤ تو نیند بھی آجائے گی تمہیں۔“
 کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے: ”مارتا تو اللہ میاں ہے ابا۔“
 اب عطاء اللہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہے: ”مارا کرتا تھا کبھی۔ اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ چلو اٹھو۔“

پلنگری پر کریم تھوڑا سا اٹھا تو عطاء اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے۔ ناٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان اس پر جھکا ہوا ہے۔ اس میں جا بجائی کے تیل کی کپیتیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خدا جانے کہاں تھا۔ اور زینب بھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔

کہیں سے کچھ مانگتے گئی ہوگی۔ عطاء اللہ ہنسنے لگا۔ لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا۔ سامنے موری کے پاس بہت سے ہتھر پڑے تھے۔ ان پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو۔

مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے بکیش کی کہ اسے اپنے

بازوؤں میں اٹھائے اور سر سے اوپر لے جا کر تختروں پر پٹک دے، مگر اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی: ”جیناں—جیناں—“ زینب معلوم نہیں کہاں ہے— کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور اس کے فریب میں آگئی ہوگی۔ میرے لئے اس نے کہیں خود کو بچ تو نہیں دیا—

یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ کریم کو پاس بہتی ہوئی بدرو میں پھینک کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا— اتنا تیز دوڑا کہ چند منٹ میں ہسپتال پہنچ گیا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی بیوی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: ”تم دعا باز ہو— تم نے مجھے دھوکا دیا ہے— اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے، تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا ہے۔“ کسی مرد کی آواز سنائی دی: ”تم غلط کہتی ہو— تم اس کو پسند نہیں آئیں اس لئے وہ چلا گیا۔“

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی: ”بکواس کرتے ہو— ٹھیک ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں— میرا وہ پہلا سارنگ روپ نہیں رہا— لیکن وہ مجھے قبول کر لیتا اگر تم بھانجی نہ مارتے— تم بہت ظالم ہو— بڑے کٹھور ہو—“ اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی: ”میں کبھی تمہارے ساتھ نہ چلتی— میں کبھی ذلت میں نہ گرتی اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دنوں کے بھوکے نہ ہوتے— تم نے کیوں یہ ظلم کیا؟“

اس مرد نے جواب دیا: ”وہ— وہ کوئی بھی نہیں تھا— میں خود تھا— جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں نے خود کو پہچانا— اور تم سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے— وہ جس کے لئے تمہیں لایا تھا— مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا— تمہارے بچے مرجائیں گے— تم بھی مر جاؤ گی— لیکن.....“

”لیکن کیا—“ اس کی بیوی نے نیکی آواز میں پوچھا۔

”میں مرتے دم تک زندہ رہوں گا— تم نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا ہے جو موت سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی— چلو آؤ— عطاء اللہ ہمیں بلارہا ہے۔“

”عطاء اللہ یہاں کھڑا ہے۔“ عطاء اللہ نے پھنجی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے پلٹے— اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا تھا: ”تم!“

”ہاں میں..... تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا: ”جیناں— میں نے رحیم اور کریم، دونوں کو مار ڈالا ہے— اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔“

زینب چیخی: ”مار ڈالا تم نے! دونوں بچوں کو؟“
عطاء اللہ نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا: ”ہاں— انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی— میرا خیال ہے تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب جو موجود ہیں!“
ڈاکٹر کاہنے لگا— عطاء اللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا: ”ایسا انجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے۔“

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور سرخج میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکہ لگا دیا۔ ٹیکہ لگتے ہی وہ فرش پر گر گئی اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ ”میرے بچے— میرے بچے“ تھے مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاء اللہ نے اطمینان کا سانس لیا: ”چلو یہ بھی ہو گیا— اب میں باقی رہ گیا ہوں“

”لیکن..... لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں لکت تھی۔
عطاء اللہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا:
”کوئی بات نہیں— میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں، تم بھاگ کر زہر لے کر آؤ۔“

بستر پر لیٹ کر سرخ کھر درے کبل میں اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کمرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدو خال نظر نہیں آتے تھے— ایک لمبا، بت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا— یا شاید کمرہ جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا گیا۔ عطاء اللہ کی چار پائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو اس کی بیوی سے ہر وقت ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑے پیار سے دلاسا دیتا تھا۔

عطاء اللہ نے اسے پہچانا تو اٹھنے کی کوشش کی: ”آئیے ڈاکٹر صاحب!“
مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطاء اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کمرہ دور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اونچی آواز جو چیخ

سے مشابہ تھی، زینب کی تھی، اس کی بیوی کی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطاء اللہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زینب کو آواز دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دھند پھر چھانے لگی اور وارڈ لمبا۔ بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطاء اللہ کو جھنجھوڑنا شروع کیا: ”میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ میں نے اسے حرامزادے کو مار ڈالا ہے۔“

”کس کو؟“

اسی کو جو مجھ سے اتنی ہمدردی کرتا تھا..... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچالے گا..... وہ جھوٹا تھا..... دعا باز تھا اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا۔ اس نے مجھے۔ اس نے مجھے۔ ”اس کے آگے زینب کچھ نہ کہہ سکی۔ عطاء اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔“ تمہیں تو اس نے مار ڈالا تھا؟“

زینب چیخی: ”نہیں۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔“

عطاء اللہ چند لمحے خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زینب کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا: ”تم ادھر ہو جاؤ۔ وہ آ رہا ہے۔“

”کون؟“

”وہی ڈاکٹر۔ وہی فرشتہ۔“

فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی چار پائی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرخ تھی۔ عطاء اللہ مسکرایا: ”لے آئے!“ فرشتے نے اثبات میں سر ہلایا: ”ہاں، لے آیا۔“ عطاء اللہ نے اپنا لرزاں بازو اس کی طرف بڑھایا: ”تو لگا دو۔“ فرشتے نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔ عطاء اللہ مر گیا۔

زینب اسے جھنجھوڑنے لگی: ”اٹھو۔ اٹھو! کریم، رحیم کے بابا، اٹھو۔ یہ ہسپتال بہت بری جگہ ہے۔ چلو گھر چلیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی!

نوبھائی

حیدرآباد سے شہاب آیا تو اس نے بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہلا قدم رکھتے ہی حنیف سے کہا۔ ”دیکھو بھائی، آج شام کو وہ معاملہ ضرور ہوگا ورنہ یاد رکھو میں واپس چلا جاؤں گا۔“

حنیف کو معلوم تھا کہ وہ معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ شام کو اس نے ٹیکسی لی۔ شہاب کو ساتھ لیا۔ گرانٹ روڈ کے ٹاکے پر ایک دلال کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”میرے دوست حیدرآباد سے آئے ہیں۔ ان کے لئے ایک اچھی چھو کری چاہئے۔“

دلال نے اپنے کان سے اڑی ہوئی بیڑی نکالی اور اس کو ہونٹوں میں دبا کر کہا۔ ”دکئی چلے گی؟“

حنیف نے شہاب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شہاب نے کہا۔ ”نہیں بھائی۔ مجھے کوئی مسلمان چاہئے۔“

”مسلمان؟“ دلال نے بیڑی کو چوسا ”چلے“ اور یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور سے اس نے کچھ کہا ٹیکسی اشارٹ ہوئی اور مختلف بازاروں سے ہوتی ہوئی فورجٹ اسٹریٹ کی ساتھ والی گلی میں داخل ہوئی۔ یہ گلی ایک پہاڑی پر تھی۔ بہت اونچائی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو فرسٹ گئیر میں ڈالا۔ حنیف کو ایسا محسوس ہوا کہ راستے میں ٹیکسی رک کر واپس چلنا شروع کر دے گی، مگر ایسا نہ ہوا۔ دلال نے ڈرائیور کو اونچائی کے عین آخری سرے پر جہاں چوک سا بنا تھا رکھنے کے لئے کہا۔

حنیف کبھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ اونچی پہاڑی تھی جس کے دائیں طرف ایک دم ڈھلان تھی۔ جس بلڈنگ میں دلال داخل ہوا اس کی صرف دو منزلیں تھیں، حالانکہ دوسری طرف کی بلڈنگیں سب کی سب چار منزلہ تھیں۔ حنیف کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈھلان کے باعث اس بلڈنگ کی تین منزلیں نیچے تھیں۔ جہاں لفٹ جاتی تھی۔

شہاب اور حنیف دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ راستے میں دلال نے اس لڑکی کی بہت تعریف کی تھی۔ جس کو لانے وہ اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ بڑے اچھے خاندان کی لڑکی ہے آپٹیل طور پر آپ کے لئے نکال رہا ہوں۔“
دونوں سوچ رہے تھے یہ لڑکی کیسی ہوگی جو آپٹیل طور پر نکالی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دلال نمودار ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا ”گاڑی واپس کرو۔“ یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک چکر لے کر مڑی تین چار بلڈنگیں چھوڑ کر دلال نے ڈرائیور سے کہا ”روک لو“ پھر حنیف سے مخاطب ہوا۔ ”آ رہی ہے۔۔۔۔۔ پوچھ رہی تھی۔ کیسے آدی ہیں۔ میں نے کہا نمبرون“

دس پندرہ منٹ کے بعد ایک دم ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ایک عورت حنیف کے ساتھ بیٹھ گئی۔ رات کا وقت تھا گلی میں روشنی کم تھی اس لئے شہاب اور حنیف اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے کہا۔ ”چلو“
ٹیکسی تیزی سے نیچے اترنے لگی۔

حنیف کے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کوئی معاملہ ہو سکے، چنانچہ جیسا طے پایا تھا وہ ڈاکٹر خاں صاحب کے ہاں چلے گئے۔ وہ ملٹری ہاسپٹل میں محتین تھا اور اس کو وہیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ شہاب نے بمبئی آتے ہی اس کو فون کر دیا تھا کہ حنیف کے ساتھ رات کو اس کے پاس آئے گا اور معاملہ ساتھ ہوگا۔ چنانچہ ٹیکسی ملٹری ہسپتال میں پہنچی۔ دلال سو روپیہ لے کر گرانٹ روڈ پر اتر گیا۔

راستے میں بھی شہاب اور حنیف اس عورت کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔ کوئی خاص باتیں بھی نہ ہوئیں۔ شہاب نے جب اس سے اپنے ٹھیکے حیدر آبادی لےجے میں پوچھا۔ ”آپ کا اسم گرامی؟“ تو اس عورت نے کہا۔ ”نوبھائی۔“

نوبھائی، حنیف سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسا نام ہے۔ ڈاکٹر خان ان کا انتظار کر رہا تھا۔ سب سے پہلے شہاب کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں گلے ملے اور خوب ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

ڈاکٹر خان نے جب ایک جوان عورت کو دروازے میں دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ ”آئیے آئیے“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”ڈاکٹر خان۔۔۔ آپ؟“ اس نے شہاب کی طرف دیکھا۔

شہاب نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ عورت نے کہا۔ ”نوبہابی۔“
ڈاکٹر خان نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“
”نوبہابی مسکرائی، مجھے بھی خسی ہوئی۔“

شہاب اور حنیف نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر خان نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے دوستوں سے کہا۔ ”آپ دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ شہاب نے جب نوبہابی سے کہا ”چلے“ تو اس نے ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”نہیں آپ بھی تشریف لائیے۔“

”آپ تشریف لے چلے میں آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر خان نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
شہاب اور حنیف نوبہابی کو اندر لے گئے۔ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی تو ان کو معلوم ہوا کہ اس کی زبان موٹی تھی۔ وہ شین اور سین ادا نہیں کر سکتی تھی اس کے بدلے اس کے منہ سے فنگلی تھی۔ اس کا نام اس لحاظ سے نوبہابی تھا۔ لیکن کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ نوبہا اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھی۔ بے پورا اس کا وطن تھا، جہاں سے وہ چار سال ہوئے بھاگ کر یہی چلی آئی تھی۔ اس سے زیادہ اس نے اپنے حالات نہ بتائے۔
”معمولی شکل و صورت تھی۔ آنکھیں بڑی نہیں تھیں۔ ناک بھی خوش وضع نہیں تھی۔

بالائی ہونٹ کے عین درمیان ایک چھوٹے سے زخم کا نشان تھا۔ جب وہ بات کرتی تو یہ نشان تھوڑا سا پھیل جاتا۔ گلے میں اس نے جڑاؤ نکلس پہنا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔

بہت ہی باتونی عورت تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ حنیف اور شہاب صرف ہوں ہاں کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ وہ کیا کرتے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا عمر ہے، فادی فندہ ہیں یا غیر فادی فندہ، حنیف اتنا بلا کیوں ہے، فہاب نے دو مصوغی دانت کیوں لگوائے ہیں۔ گوشت خورہ تھا تو اس کا علاج ڈاکٹر خاں سے کیوں نہیں کرایا۔ فرماتا کیوں ہے فخر کیوں نہیں گاتا۔

شہاب نے اسے کچھ شعر۔ نائے، شوبھانے بڑے زوروں کی داد دی۔ جب شہاب

نے یہ شعر سنایا۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانوں اٹھتی جوانیاں ہیں
تو شوبھا اچھل پڑی۔ ”واہ جناب صاحب واہ۔۔۔ بہت اچھا نعر ہے۔“
”اٹھتی جوانیاں ہیں۔۔۔ واہ وا۔۔۔!“

اس کے بعد شوبھانے بے شمار شعر سنائے، بالکل بے جواز، بے نکلے۔ جن کا سر تھانہ
پیر۔ شعر سنا کر اس نے شہاب سے کہا۔ ”فہاب صاحب۔ مزا آیا آپ کو۔“
شہاب نے جواب دیا۔ ”بہت“
شوبھانے شرمناک کہا۔۔۔ یہ نعر میرے تھے۔۔۔ مجھے قاعری کا بہت فوق ہے۔“
شہاب اور حنیف دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ اس کے
بعد صرف ایک صحیح شعر شوبھانے سنایا

کبھی تو میرے درد دل کی خبر لے
میرے درد سے آفتا ہونے والے
یہ شعر حنیف کئی بار سن چکا تھا اور شاید پڑھ بھی چکا تھا۔ مگر شوبھانے کہا۔
حنیف صاحب یہ نعر بھی میرا ہے۔“
حنیف نے خوب داد دی۔ ”مافا اللہ آپ تو کمال کرتی ہیں۔“
شوبھا چوگی۔ ”معاف کیجئے گا، میری زبان میں تو کچھ خرابی ہے لیکن آپ نے کیوں
مافا اللہ کے بدلے مافا اللہ کہا۔“

حنیف اور شہاب دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ شوبھا بھی ہنسنے لگی۔ اتنے میں ڈاکٹر خان
آگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی شوبھا سے کہا۔ ”کیوں جناب اتنی لمبی کس بات پر آرہی ہے۔“
زیادہ ہنسنے کے باعث شوبھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے رومال سے ان کو
پونچھا اور ڈاکٹر خان سے کہا۔ ”ایک بات ایسی ہوئی کہ ہم سب ہنسنے پڑے۔“
شوبھانے اس سے کہا۔ ”آئیے بیٹھے۔“ چارپائی کے ایک طرف سرک کر اس نے
ڈاکٹر خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

پھر شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ شوبھانے لمبی لمبی چار بے نکی غزلیں سنائی۔ سب نے
داد دی۔ شہاب اکتا گیا۔ وہ معاملہ چاہتا تھا۔ حنیف اس کے بدلے ہوئے تو رد کیے کر بھانپ گیا،

چنانچہ اس نے شہاب سے کہا۔ ”اچھا بھئی میں رخصت چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہوگی۔“

وہ یہ کہہ کر کرسی پر سے اٹھا مگر شوبھانے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں آپ نہیں جاسکتے۔“
حنیف نے جواب دیا۔ ”میں معذرت چاہتا ہوں۔ بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“
”اوہ۔۔۔! لیکن نہیں، آپ تھوڑی دیر اور ضرور بیٹھیں، ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔“
شوبھانے اصرار کیا۔

شہاب نے ایک جمائی لی۔ ”بہت وقت ہو گیا ہے۔“
شوبھانے مسکرا کر شہاب کی طرف دیکھا میں فاری رات آپ کے پاف ہوں۔“
شہاب کا تکرر دور ہو گیا۔

حنیف تھوڑی دیر بیٹھا پھر رخصت لی اور چلا گیا۔ دوسرے روز صبح نوبج کے قریب شہاب آیا اور رات کی بات سنانے لگا۔ ”عجیب و غریب عورت تھی یہ نوبھائی۔۔۔۔۔ پیٹ پر باشت بھر آپریشن کا نشان تھا۔ کہتی تھی کہ وہ ایک لکڑی والے سیٹھ کی داشتہ تھی۔ اس نے ایک فلم کمپنی کھول دی تھی۔ اس کے چٹکوں پر دستخط شوبھائی کے ہوتے تھے۔ موٹھی جواب تک موجود ہے۔ نوکر چاکر تھے۔ لکڑی والا سیٹھ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اس نے ایک ہزار روپیہ یتیم خانے کو دیا۔“

حنیف نے پوچھا۔ ”یہ لکڑی والا سیٹھ اب کہاں ہے۔“
شہاب نے جواب دیا۔ ”دوسری دنیا میں ٹال کھولے بیٹھا ہے۔“ عورت خوب تھی یہ نوبھائی۔۔۔۔۔ میں دوسرے کمرے میں سو گیا تو وہ ڈاکٹر خان کے ساتھ لیٹ گئی۔ صبح پانچ بجے خان نے اس سے کہا کہ اب جاؤ، شوبھانے کہا۔ ”اچھا میں جاتی ہوں، لیکن یہ میرے زیور تم اپنے پاس رکھ لو۔ میں اکیلی ان کے ساتھ باہر نہیں نکلتی۔“

حنیف نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر نے زیور رکھ لئے؟“

شہاب نے سر ہلایا۔

ہاں۔۔۔۔۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ نقلی ہیں۔ مگر دن کی روشنی میں جب اس نے دیکھا تو اصلی تھے۔“

”اور وہ چلی گئی۔“

”ہاں چلی گئی۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر کہ وہ کسی روز آکر اپنے زیور واپس لے جائے گی۔“

”یہ تم نے بڑے اچنبھے کی بات سنائی۔“

”خدا کی قسم حقیقت ہے۔“ شہاب نے سگریٹ سلگایا۔ ”اسی لئے تو میں نے کہا یہ نوبھائی

بائی عجیب و غریب عورت ہے۔“

حنیف نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”ویسے کیسی عورت تھی؟“

شہاب جھینپ سا گیا بھی مجھے ایسے معاملوں کا کچھ پتہ نہیں۔۔۔۔۔ یہ تم خان سے

پوچھنا۔ وہ ایک پسر ہے۔“

شام کو دونوں خان سے ملے۔ زیور اس کے پاس محفوظ تھے۔ شو بھالینے نہیں آئی تھی۔

خان نے بتایا۔ ”میرا خیال ہے شو بھا، کسی دماغی صدمے کا شکار ہے۔“

شہاب نے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے پاگل ہے۔“

خان نے کہا ”نہیں۔۔۔۔۔ پاگل نہیں ہے لیکن اس کا دماغ یقیناً نارمل نہیں، بے حد مخلص

عورت ہے، ایک لڑکا ہے اس کا بچہ پور میں۔۔۔۔۔ اس کو برابر دوسروں سے ماہوار بھیجتی ہے، ہر

تیسرے مہینے اس سے ملنے جاتی ہے، جے پور پہنچتے ہی برقع اوڑھ لیتی ہے۔ وہاں اسے پردہ کرنا

پڑتا ہے۔“

حنیف نے کہا ”یہ تم نے کیسے سمجھا کہ اس کا دماغ نورل نہیں۔“

خان نے جواب دیا ”بھئی میرا خیال ہے۔۔۔۔۔ نورل ہوتی تو اپنے ڈیڑھ دو ہزار کے

زیور ایک اجنبی کے پاس کیوں چھوڑ جاتی۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اس کو مورفیا کے انجکشن لینے کی

عادت ہے۔“

شہاب نے پوچھا۔ ”نشہ ہوتا ہے ایک قسم کا؟“

خان نے جواب دیا ”بہت ہی خطرناک قسم کا۔۔۔۔۔ شراب سے بھی بدتر!“

”اس کی عادت کیسے پڑی اسے؟“ شہاب نے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا کر دوات پر

رکھ دیا۔

”آپریشن ہوا تو بگڑ گیا۔ درد شدت کا تھا۔ اس کا احساس کم کرنے کے لئے ڈاکٹر مورفیا

کے انجکشن دیتے رہے۔ تقریباً دو مہینے تک۔۔۔۔۔ بس عادت ہو گئی۔“

ڈاکٹر خان نے مورفیا اور اس کے خطرناک اثرات پر ایک لیکچر سا شروع کر دیا۔

ایک ہفتہ ہو گیا، شو بھا نہ آئی۔ شہاب واپس حیدر آباد چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر خان زیور لے

کر حنیف کے پاس آیا کہ چلو دے آئیں۔۔۔۔۔ نے گرانٹ۔۔۔۔۔ کے ناکے پر دلال کو بہت تلاش

کیا جو شہاب اور حنیف کو شوبھا کے مکان کے پاس لے گیا تھا۔ مگر وہ نہ ملا۔ حنیف کو اتنا معلوم تھا کہ گلی کون سی ہے اور بلڈنگ کون سی ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم پتہ لگالیں گے۔۔۔ یہ زیور میں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا، چوری ہو گئے تو کیا کروں گا۔ وہ تو عجیب بے پروا عورت ہے۔“
دونوں ٹیکسی میں وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خان کو حنیف نے بلڈنگ بتادی اور کہا۔
”میں نہیں جاؤں گا بھائی تم تلاش کرو اسے۔“

ڈاکٹر خان اکیلا اس بلڈنگ میں داخل ہوا۔ ایک دو آدمیوں سے پوچھا۔ مگر شوبھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔ نیچے سے لفٹ اوپر کو آئی تو ہوٹل کا چھوکر ایپالیاں اٹھائے باہر نکلا۔ خان نے اس سے پوچھا، تو اس نے بتایا کہ سب سے چلی منزل کے آخری فلیٹ پر چلے جاؤ۔۔۔ لفٹ کے ذریعے سے خان نیچے پہنچا۔ آخری فلیٹ کی کھنٹی بجائی تو ڈی دیر کے بعد ایک بڑھیا نے دروازہ کھولا۔
خان نے اس سے پوچھا ”شوبھا، بالی ہیں؟“

بڑھیا نے جواب دیا۔

”ہاں ہیں“

خان نے کہا ”جاؤ اس سے کہو ڈاکٹر خان آئے ہیں۔“

اندر سے شوبھا کی آواز آئی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب آئیے۔“

ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا، جھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ چمکیلے فرنیچر سے بھرا ہوا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ بڑھیا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فوراً ہی شوبھا کی آواز آئی۔ ”ڈاکٹر صاحب آجائیے۔۔۔ میں باہر نہیں آسکتی۔“

ڈاکٹر خان دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔

شوبھا چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ خان نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔“

شوبھا مسکرائی۔

”کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب، تیل مالف کر رہی تھی۔“

ڈاکٹر پٹنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکالا۔ جس میں زیور بندھے تھے۔ کھول کر اسے پٹنگ پر رکھ دیا۔ ”کب تک میں تمہارے ان زیوروں کی حفاظت کرتا رہوں گا۔“

تم ایسی گئیں کہ پھر ادھر کا رخ تک نہ کیا۔“
شوبھائی۔

مجھے بہت کام تھے۔۔۔۔۔ لیکن آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خوداف سے لے جاتی۔“ پھر اس نے بڑھیا سے کہا۔ ”چاہے منگا ڈاکٹر فاحب کے لئے۔“
ڈاکٹر نے کہا۔

نہیں مجھے اب جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”ہسپتال“

”ٹیکسی میں آئے ہیں آپ؟“

”ہاں۔“

”باہر کھڑی ہے۔“

ڈاکٹر نے سر کے اشارے سے ”ہاں“ کہا۔

”تو آپ چلے میں آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے زیور تیکے کے نیچے رکھ دیئے اور رومال ڈاکٹر خان کو دے دیا۔ ڈاکٹر خان، حنیف کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا۔ ”مل گئی؟“
ڈاکٹر مسکرایا۔

مل گئی۔۔۔۔۔ آ رہی ہے!“

پندرہ بیس منٹ کے بعد شوبھائی نے تیزی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اندر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خان کے کمرے میں دیر تک فضول قسم کی شعر بازی ہوتی رہی۔ ہجر وصال اور عشق و محبت کے بے شمار عامیانہ اشعار شوبھائی نے سنائے اور انہیں اپنے نام سے منسوب کیا۔

”ڈاکٹر خان اور حنیف نے خوب داد دی۔ شوبھائی بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

”یعقوب فیٹھ گھنٹوں مجھ سے فخر فٹا کرتے تھے۔“

”یعقوب فیٹھ وہ لکڑی والا سیٹھ تھا، جس نے شوبھائی کے لئے ایک فلم کمپنی کھولی تھی

”ڈاکٹر خان اور حنیف ہنس پڑے۔ شوبھائی ہنسے لگی۔

ڈاکٹر خان اور شوبھائی دوستی ہو گئی۔ شروع شروع میں تو وہ ہفتے میں دو بار آتی۔ اب

قریب قریب ہر روز آنے لگی۔ رات آتی صبح سویرے چلی جاتی۔ شام کو بلا ناغہ مورنیا کا انجکشن لیتی۔

ڈاکٹر انجکشن لگانے سے پہلے اس کے بازو پر بے حس کرنے والی دوا لگا دیتا تھا۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی چیز اسے بہت پسند تھی۔

تین مہینے گزرے تو شو بھاجے پور جانے کے لئے تیار ہوئی۔ موٹر اپنی خان کے حوالے کر دی کہ وہ اس کا دھیان رکھے۔ ڈاکٹر اسے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا۔۔۔ دیر تک گاڑی میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو شو بھانے ایک دم ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے کیوں ایک دم ایسا لگا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”کیا ہونے والا ہے۔“ شو بھاجے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔
”معلوم نہیں میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

ڈاکٹر خان نے اسے دم دلا سادیا۔ گاڑی چل دی۔ دور تک شو بھاجا ہاتھ ہلتا رہا۔ جے پور سے شو بھاجے دو خط آئے۔ جن سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ جب واپس آئیں تو اس کے لئے بہت سے تحفے لائے گئے۔ اس کے بعد ایک کارڈ آیا جس میں یہ لکھا تھا۔ ”میری اندھیری زندگی میں صرف ایک دیا تھا وہ کل خدا نے بجھا دیا۔۔۔ بھلا ہو اس کا!“

ڈاکٹر خان نے یہ الفاظ پڑھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، بھلا ہو اس کا، میں بے پناہ غم تھا۔

بہت عرصہ گزر گیا شو بھاجا کوئی خط نہ آیا۔ پورا ایک برس بیت گیا۔ ڈاکٹر خان کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ شو بھاجا اپنی موٹر اس کے حوالے کر گئی تھی۔ اس بلڈنگ میں گیا، جس کی سب سے چلی منزل میں وہ رہا کرتی تھی۔ فلیٹ پر کوئی اور ہی قابض تھا۔ ایک دلال قسم کا آدمی۔۔۔ ڈاکٹر خان آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔ موٹر اس نے ایک گیراج میں رکھوا دی۔

ایک دن حنیف گھبراہوا ہسپتال آیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ ڈاکٹر خان کو ڈیوٹی سے ہٹا کر ایک طرف لے گیا اور اس سے کہا۔ ”میں نے آج شو بھاجا کو دیکھا۔“

ڈاکٹر حنیف کا بازو پکڑ کر ایک دم پوچھا۔ ”کہاں؟“

عوپائی پر۔۔۔ میں اسے بالکل نہ پہچانتا کیونکہ وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔“ ڈاکٹر خان کھوکھلی آواز میں بولا:

”ہڈیوں کا ڈھانچہ“

فوبہا بانی

حنیف نے سرد آہ بھری۔ ”شو بھا نہیں تھی۔ اس کا سایہ تھا۔ آنکھیں اندر کود حنسی ہوئیں۔
 — بال پریشان اور گرد آلود۔۔۔۔۔ یوں چلتی تھی کہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہے۔ میرے پاس
 آئی اور کہا۔۔۔۔۔ ”مجھے پانچ روپے دو۔۔۔۔۔ میں نے اس کو نہ پہچانا۔ پوچھا۔۔۔۔۔ کیا کروگی پانچ
 روپے لے کر۔۔۔۔۔ بولی مورفیا کا ٹیکہ لوں گی۔۔۔۔۔ ایک دم میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا
 — اس کے بالائی ہونٹ پر زخم کا نشان موجود تھا۔۔۔۔۔ میں چلا آیا۔۔۔۔۔ ”شو بھا۔۔۔۔۔ اس نے
 تھکی ہوئی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پوچھا، کون ہو تم۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ حنیف
 — اس نے جواب دیا۔ میں کسی حنیف کو نہیں جانتی۔ میں نے تمہارا ذکر کیا کہ تم نے اسے بہت
 تلاش کیا، بہت ڈھونڈا۔۔۔۔۔ یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور کہنے لگی۔
 ”اس سے کہنا مت ڈھونڈے مجھے۔ میری طرف دیکھو۔ میں اتنی مدت سے اپنا کھویا ہوا لال
 ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ ڈھونڈنا بالکل بے کار ہے۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ملتا۔۔۔۔۔ لاؤ پانچ روپے
 دو مجھے۔۔۔۔۔ میں نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا۔ اپنی موٹر تو لے جاؤ ڈاکٹر خان سے۔“ وہ تہمتے
 لگاتی ہوئی چلی گئی۔

خان نے پوچھا۔ ”کہاں؟“

حنیف نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں۔۔۔۔۔“ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی ہوگی۔“
 ڈاکٹر خان نے بہت تلاش کیا مگر شو بھا کا کچھ پتہ نہ چلا۔

(۱۲ جون ۱۹۵۰ء)



قادر اقصائی

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دور دور سے رئیس اس کا مجرا سننے کے لئے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبد اللہ سے جولا کھول میں کھیلتا تھا اسے محبت ہو گئی۔ اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبد اللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا اور رات بھر کر صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اس کا ایک چاہنے والا بڑھئی تھا۔ مگر وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی وہ بے چارہ ضرورت سے زیادہ محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا مگر وہ اسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ اس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا۔ لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا۔

زہرہ جان میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر اداپ سینکڑوں روپے بچھاور کرتے ہیں۔ لیکن تمہیں

شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت، مہن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔ معلوم نہیں کیوں۔“

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھتی کادل مجروح ہو گیا۔ ”تم ہنستی ہو۔ میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو، اس لئے کہ یہ کنگے کی محبت ہے جو کنگڑیوں کو چیر کر اپنی روزی کھاتا ہے۔۔۔۔۔ یاد رکھو یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمہیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لئے موجود ہے۔ زہرہ جان اکتا گئی۔ اس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ بڑھتی کو باہر نکال دو لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ ایک برس کے بعد عیدین پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ اس کا باپ عبداللہ تھا کوئی اور اس کے متعلق کوئی کبھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض خیال ہے کہ وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے۔۔۔۔۔ کسی کے نطفے سے بھی ہو مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

ادھر زہرہ جان کی عمر دھلتی گئی۔ ادھر عیدن جوان ہوتی گئی۔ اس کی ماں نے اس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی۔ کئی استادوں سے اس نے سبق لئے اور ان سے داد و وصول کی۔ ————— زہرہ جان کی عراب چالیس برس کے قریب ہوگئی۔ وہ اس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے۔ وہ اپنی الکلوٹی لڑکی عیدن کے سہارے جی رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن بآلی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ایک نٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی نقیہ اتارنے کے لیے اپنی اپنی پیش کش بھیجتے۔

مگر اس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نفسی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے۔۔۔۔۔ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی۔ سارے شہر میں اس جیسی لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے لیے وہ ہر جمعرات کی شام کو اس کے ساتھ پیدل باہر سیر کو جاتی۔ عشق پیٹھ مرد اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔

پھنسی پھنسی چولی میں گدرا یا ہوا جو بن، سڈول بانئیں، مخروطی انگلیاں جن کے ناخنوں پر جیتا جیتا لہو ایسا رنگ، ٹھکرا سادہ، ٹھکڑیا لے بال۔ قدم قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔ آخر ایک

روزِ زہرہ جان کی امید برآئی۔ ایک نواب عیدن پر ایسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مٹی کی رسم کے لیے بڑا اہتمام کیا اور کئی دیکیں پلاؤ اور تنجین کی چڑھائی کیں۔

شام کو نواب اپنی بکھی میں آئے۔ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ نواب صاحب بڑے خوش ہوئے۔ عیدن دلہن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اس کا بجر شروع ہوا۔ پھٹ پڑنے والا شاب تھا جو ٹونفہ سرائی تھا۔ عیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش ہر ادا اس کے گانے کا ہر سر جادو شکن تھا۔ نواب صاحب گاؤ سکتے کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی۔ یہ وہی بڑھی تھا اس کا عاشق زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب کو جو بہت نفاست پسند تھے ابکائیاں آنے لگیں۔ انہوں نے زہرہ جان سے کہا۔ ”یہ کون بد تیز ہے۔“

بڑھی مسکرایا ”حضور میں ان کا عاشق ہوں۔“

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی۔ زہرہ جان نے کہا نکالو اس حیوان کو باہر۔ بڑھی نے اپنے تھیلے سے آری نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔ بڑھی نے اپنا کام بڑے اطمینان سے ختم کیا اور لبو بھری آری اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبال جرم کر لیا۔۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔ عیدن کو اپنی ماں کے قتل ہونے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ دواڑھائی مہینے تک بیمار رہی۔۔۔۔۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمارداری صرف اس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اس پر جان چھڑکتے تھے بھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لیے نہ آئے۔۔۔۔۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی وہ اگرچہ چھوڑ کر دہلی چلی آئی۔۔۔۔۔ مگر اس کی طبیعت اتنی ادا اس تھی کہ اس کا جی قطعاً بھرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس بیچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جن میں آدھے اس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انہیں بیچتی رہی اور گزارہ کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔ جب وہ کوئی چوڑی یا

نکلس ادا نے پونے داسوں بچتی تھی۔

لیکن آخر کیا کرتی۔ اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ راگ رنگ کی محفلیں قائم کرے۔ ان دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زوروں پر تھا۔ آخر ایک دن اعلان ہوا جو عیدین نے اپنے پانچ والیوم ریڈیو سیٹ پر سنا کہ ہندوستان کے دو حصے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مارتے، مسلمان ہندوؤں کو۔۔۔ اور عجب عالم تھا، خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑا پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدین نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ دہلی نہیں رہے گی لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کئی زیورات بچ کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشتوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے مسلمان بھائیوں ہی نے غائب کر دیے۔ جب وہ لاہور پہنچی تو وہ لٹی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن اس کا حسن ویسے کا دیا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں لپٹائی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے بے اعتنائی کرتی۔ وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہوگی؟

اس کے پاس تو پچھلے کھانے کے لیے بھی چند پیسے نہیں تھے۔ لیکن لڑکی ذہین تھی۔ سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں۔ یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ان دنوں لاہور میں روپیہ عام تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا۔ ہیرا منڈی کے دارے نیا رہے تھے۔

عیدین کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اس کی سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوئی وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی۔ یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ عیدین اس کے بعد ایک علیحدہ کونٹھا کرائے پر لے کر وہاں اٹھ آئی، کیونکہ جہاں وہ مقیم تھی اس نائیکہ کو اسے اپنی آدمی آمدن دینا پڑتی تھی۔ جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پر بھرا کر نا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی۔ اس نے کئی زیور بنوائے۔ کپڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کروا لئے۔ اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کمائے تھے۔ خوبصورت تھا۔ اس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پر وہ عیدین کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کھلی سفید پیکارڈ اس کے حوالے

اس کے علاوہ ہر شام آتا اور کم از کم ڈھائی سو روپے اس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا: ”کیا بات ہے آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے، عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا۔ ”آج کل لٹھا کہاں ملتا ہے؟“

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ کے بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے۔ اس کے تیسرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا۔ مگر لاہور میں اسے قادراقصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا۔ بغیر ریٹے کی ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریٹم کی بنی ہو۔

دکان پر اپنا شاگرد بٹھا کر قادراصبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی عیدن کے حوالے کر دیتا۔ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا جو عام طور پر گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ جس کا نام ظفر شاہ تھا۔ عیدن کے عشق میں بہت بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اس سے شادی کر لے۔ مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھرے سے فارغ ہو کر رات کے دو تین بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب ظفر شاہ اپنا غم غلط کر کے ————— یعنی شراب پی کر پیدل ہی چلا آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ————— کے بچکے کے باہر عیدن ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجا کر رہی ہے کہ خدا کے لیے مجھ پر نظر کرم کرو۔ میں دل و جان سے تم پر فدا ہوں ————— تم اتنے ظالم کیوں ہو ————— اور وہ شخص جسے غور سے دیکھنے پر ظفر شاہ نے پہچان لیا کہ قادراقصائی ہے جو اسے دھتکار رہا ہے ”جا۔۔۔۔۔ ہم نے آج تک کسی کجبری کو منہ نہیں لگایا ————— مجھے تنگ نہ کیا کر!“

قادرا اسے شوکریں مارتا رہا اور عیدن اسی میں لذت محسوس کرتی رہی۔

قبض

نے لکھے ہوئے مکالے کا غذ میرے ہاتھ میں تھا۔ ایکسٹرا ڈائریکٹر کیمرے کے پاس سامنے کھڑے تھے، شوٹنگ میں ابھی کچھ دیر تھی اس لئے کہ اسٹوڈیو کے ساتھ والا صابن کا کارخانہ چل رہا تھا۔ ہر روز اس کارخانے کے شور کی بدولت ہمارے سیٹھ صاحب کا کافی نقصان ہوتا تھا۔ کیونکہ شوٹنگ کے دوران میں ایکایک کی جب اس کارخانے کی کوئی مشین چلنا شروع ہو جاتی تو کئی کئی ہزار فنٹ فلم کا کلکڑا بیکار ہو جاتا۔ اور ہمیں نئے سرے سے کئی سینوں کی دوبارہ شوٹنگ کرنا پڑتی۔ ڈائریکٹر صاحب ہیر واور ہیر وئن کے درمیان کیمرے کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اور میں سستانے کی خاطر کرسی پر ناگئیں سمیت بیٹھا تھا۔ وہ یوں کہ میری دونوں کرسی کی نشست پر تھیں۔ اور میرا بوجھ نشست کے بجائے ان پر تھا۔ میری اس عادت پر بہت لوگوں کا اعتراض ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ مجھے اصلی آرام صرف اسی طریقے پر بیٹھنے سے ملتا ہے۔

نینا جس کی دونوں آنکھیں بھینکی تھیں۔ ڈائریکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”صاحب، بولتا ہے کہ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے پھر شور بند ہو جائے گا۔“

یہ روزمرہ کی بات تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی آدھ گھنٹے تک کارخانے میں صابن کٹتے اور ان پر ٹپتے، لگتے رہیں گے۔ چنانچہ ڈائریکٹر صاحب ہیر واور ہیر وئن سمیت اسٹوڈیو سے باہر چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر بیٹھا رہا۔

سٹی لیمپ کی ناکافی روشنی میں سیٹ پر جو چیزیں پڑی تھیں ان کا درمیانی فاصلہ اصلی فاصلے پر کچھ زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور گہرے رنگ کے تھری پلائی ووڈ کے تختے جو دیواروں کی

صورت میں کھڑے تھے۔ پست قد دکھائی دیتے تھے۔ میں اس تبدیلی پر غور کر رہا تھا کہ پاس ہی سے آواز آئی۔ ”السلام علیکم“۔ میں نے جواب دیا۔ ”علیکم السلام۔“ اور مڑ کر دیکھا تو مجھے ایک نئی صورت نظر آئی۔ میری آنکھوں میں۔ ”تم کون ہو؟“ کا سوال تیر نے لگا آدمی ہوشیار تھا فوراً کہنے لگا۔ جناب میں آج ہی آپ کی کمپنی میں داخل ہوا ہوں، — میرا نام عبدالرحمن ہے۔ خاص دہلی شہر کا رہنے والا ہوں — آپ کا وطن بھی تو شاید دہلی ہی ہے!

”میں نے کہا جی نہیں — میں پنجاب کا باشندہ ہوں۔“

عبدالرحمن نے جیب سے عینک نکالی۔ ”معاف فرمائیے گا۔“ چونکہ ڈائریکٹر صاحب نے عینک اتار دینے کا حکم دیا تھا اس لئے —

اس دوران میں اس نے عینک بڑی صفائی سے کانوں میں اٹکالی اور میری طرف پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ”واللہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ آپ دہلی کے ہیں، یعنی آپ کی زبان میں قطعاً پنجابیت نہیں — ماشاء اللہ کیا مکالمہ لکھا ہے — قلم توڑ دیا ہے واللہ — یہ اسٹوری بھی تو آپ ہی نے لکھی ہے؟“

”عبدالرحمن نے جب یہ باتیں کیں تو اس کا قد بھی میری نظر میں تھری پلائی ووڈ کے تختوں کی طرح پست ہو گیا۔“ روکھے پن سے کہا۔ ”جی نہیں۔“

”وہ اور زیادہ چکیلا ہو گیا۔“ عجب زمانہ ہے صاحب، جو اہلیوں کے مالک ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں — یہ بمبئی شہر بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا، عجب اوٹ پٹانگ زبان، بولتے ہیں یہاں کے لوگ، پندرہ دن مجھے یہاں آئے ہو گئے ہیں، مگر کیا عرض کروں سخت پریشان ہو گیا ہوں، آج آپ سے ملاقات ہو گئی — اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ مل کر اس روغن کی مروڑیاں بنانا شروع کر دیں جو چہرے پر، لگاتے وقت اس کے ہاتھوں پر رہ گیا تھا۔

میں نے جواب میں صرف ”جی ہاں۔“ کر دیا اور خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور رواداری میں لکھے ہوئے مکالموں پر نظر ثانی شروع کر دی۔ چند غلطیاں جن کو درست کرنے کے لئے میں نے اپنا قلم نکالا۔ عبدالرحمن ابھی تک میرے پاس کھڑا تھا، مجھے اس کے کھڑے ہونے کے انداز سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ، میں نے پوچھا۔ ”فرمائیے۔“

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا: ”میں ایک بات عرض کروں۔“

”بڑے شوق سے۔“

”آپ اس طرح ٹانگیں اوپر کر کے نہ بیٹھا کریں۔“
”کیوں؟“

اس نے جھک کر کہا۔ ”بات یہ ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے قبض ہو جایا کرتا ہے۔“
”قبض؟“ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ”قبض کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کہہ کر میرے
جی میں آئی کہ اس سے کہوں ”میاں ہوش کی دوا کرو۔ گھاس تو نہیں کھا گئے۔“

مجھے اس طرح بیٹھتے بیس برس ہو گئے۔ آج کیا تمہارے، کہنے سے مجھے قبض ہو جائے
گا۔“ مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ بات بڑھ جائے گی۔ اور مجھے بے کار کی مغز دردی کرنا پڑے گی!
وہ مسکرایا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ گیا۔
”آپ نے مذاق سمجھا ہے، حالانکہ صحیح بات یہی ہے کہ ٹانگیں جوڑ کر پیٹ کے ساتھ لگا کر بیٹھنے سے
معدے کی حالت خراب ہو جاتی ہے، میں نے تو اپنی ناچیز رائے پیش کی ہے۔ مانیں نہ مانیں یہ
آپ کو اختیار ہے۔“

میں عجب مشکل میں پھنس گیا۔ اس کو اب میں کیا جواب دیتا قبض — یعنی قبض
ہو جائے گا۔ بیس برس کے، دوران میں مجھے قبض نہ ہوا۔ لیکن آج اس سخرے کے، کہنے سے مجھے
قبض ہو جائے گا۔ قبض کھانے پینے سے ہوتا ہے نہ کہ کرسی یا کوچ پر بیٹھنے سے۔ جس طرح میں کرسی
پر بیٹھتا ہوں، اس سے تو آدمی کو راحت ہوتی ہے۔ دوسروں کو نہ سہی لیکن مجھے تو، اس سے آرام ملتا
ہے اور یہ سچی بات ہے کہ مجھے ٹانگیں جوڑ کر سینے کے ساتھ لگا دینے سے ایک خاص قسم کی فرحت
حاصل ہوتی ہے۔ اسٹوڈیو میں عام طور پر شوٹنگ کے دوران میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ جس سے
آدمی تھک جاتا ہے۔ دوسرے نامعلوم کس طریقے سے اپنی تھکن دور کرتے ہیں۔ مگر میں تو اسی
طریقے سے دور کرتا ہوں۔ کسی کے کہنے پر میں اپنی یہ عادت کبھی نہیں چھوڑ سکتا، خواہ قبض کے
 بجائے مجھے سر سام ہو جائے۔ یہ ضد نہیں، دراصل بات یہ ہے کہ کرسی پر اس طرح بیٹھنے کا انداز میری
عادت نہیں بلکہ میرے جسم کا ایک جائز مطالبہ ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں۔ اکثر لوگوں کو میرے اس طرح بیٹھنے کے
انداز پر اعتراض ہو رہا ہے، اس اعتراض کی وجہ میں نے ان لوگوں سے نہ کبھی پوچھی ہے اور نہ
انہوں نے کبھی بتائی ہے۔ اعتراض کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو، میں اس معاملے میں دلیل سننے کے لئے
بھی تیار نہیں۔ کوئی آدمی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔

جب عبدالرحمن نے مجھ پر کتہ چینی کی تو میں بھٹا گیا۔ اور اس کا یوں شکر یہ ادا کیا، جیسے

کوئی یہ کہے۔ ”لعنت ہو تم پر۔“

اس شکرہ کی رسید کے طور پر اس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ پیدا کی اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں، ڈائریکٹر، ہیر واور ہیر وٹن آگئے اور شوٹنگ شروع ہو گئی، میں، نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اسی بہانے عبدالرحمن کے قبض سے نجات حاصل ہوئی۔

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میرے دماغ میں آئیں:-

(1) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغہ ہے،

(2) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

(3) یہ ایکسٹرا جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پر لے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

(4) یہ ایکسٹرا جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے بحد نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

اگر مجھے کسی شخص سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ کہ اس کی زندگی کچھ عرصہ

کے لئے زیادہ متحرک ہو جائے گی۔ میں نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔

آپ پوچھیں گے کہ نفرت کرنے میں مہارت کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں آپ سے کہوں گا کہ

ہر کام کرنے کے لئے ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہے اور نفرت میں چونکہ شدت زیادہ ہے۔ اس

لئے اس کے عامل کا ماہر ہونا اشد ضروری ہے، محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر

نارنک سب، محبت کرتے آئے ہیں۔ مگر نفرت بہت کم لوگوں نے کی ہے، اور جنہوں نے کی ہے

ان میں سے اکثر کو اس کا سلیقہ نہیں آیا۔ نفرت محبت کے مقابلے میں بہت زیادہ لطیف اور شفاف

ہے محبت میں مٹھاس ہے جو اگر زیادہ دیر تک قائم رہے تو دل کا، ذائقہ خراب ہو جاتا ہے، مگر نفرت

میں ایک ایسی ترشی ہے جو دل کا قوام درست رکھتی ہے۔

میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ نفرت اس طریقے سے کرنا، چاہیے کہ اس میں محبت کا مزہ

ملے۔ شیطان سے نفرت کرنے کا جو سبق ہمیں مذہب نے سکھایا ہے مجھے اس سے سو فیصدی اتفاق

ہے۔ یہ ایک ایسی نفرت ہے جو شیطان کی شان کے خلاف نہیں اگر دنیا میں شیطان نام کی کوئی ہستی

موجود ہے تو وہ یقیناً اس نفرت سے جو کہ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے خوش ہوتی ہوگی اور

سچ پوچھئے تو یہ عالمگیر نفرت ہی شیطان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر ہمیں اس سے نہایت ہی بھونڈے

طریقے پر نفرت کرنا سکھایا جاتا تو دنیا ایک بہت بڑی ہستی کے تصور سے خالی ہوتی۔

میں نے عبدالرحمن سے نفرت کرنا شروع کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اور اس کی

دونوں کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اسٹوڈیو میں اور اسٹوڈیو کے باہر جہاں کہیں اس سے میری،

ملاقات ہوتی، میں اس کی خیریت دریافت کرتا اور دیر تک باتیں کرتا رہتا۔

عبدالرحمن کا قد متوسط ہے اور بدن گٹھا ہوا۔ جب وہ نیکر پہن کر آتا تو اس کی بے بال پنڈلیوں کا گوشت فٹ بال کے سنے کورے چڑے کی طرح چمکتا ہے۔ ناک موٹی جس کی کوٹھڑی ابھری ہوئی ہے، چہرے کے خطوط سنگولی ہیں۔ ماتھا چوڑا جس پر گہرے زخم کا نشان ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شیطان لڑکے نے اپنے ڈیمک کی لکڑی میں چاقو سے جھونسا گڑھا بنا دیا ہے۔ پیٹ سخت اور ابھرا ہوا، حافظہ قرآن ہے۔ چنانچہ بات بات میں آیتوں کے حوالے دیتا ہے۔ کمپنی کے دوسرے ایکٹر اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے اس لئے کہ انہیں احترام کے باعث چپ ہو جانا پڑتا ہے۔

ڈائریکٹر صاحب کو جب میری زبانی معلوم ہوا کہ عبدالرحمن صاف زبان بولتا ہے اور غلطی نہیں کرتا تو انہوں نے اسے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایک ہی فلم میں اسے دس مختلف آدمیوں کے بھیس میں لایا گیا۔ سفید پوشاک پہنا کر اسے ہوٹل میں بیرابنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سر پر لمبے لمبے بال لگا کر اور چمٹا ہاتھ میں دے کر ایک جگہ اس کو سادھو بنا دیا گیا۔ چراسی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے چہرے پر گوند سے لمبی ڈاڑھی چپکا دی گئی۔ ریلوے، پلٹ فارم پر بڑی مونچھیں لگا کر اس کو نکلت چیکر بنا دیا گیا، — یہ سب میری بدولت ہوا۔ اس لئے کہ مجھے اس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

عبدالرحمن خوش تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ اتنا مقبول ہو گیا اور میں خوش تھا کہ دوسرے ایکٹر اس سے حسد کرنے لگے ہیں۔ میں نے موقع دیکھ کر سیٹھ سے سفارش کی، چنانچہ تیسرے مہینے، اس کی تنخواہ میں دس روپے کا اضافہ بھی ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے پچیس ایکٹر اس کی آنکھوں میں وہ خار بن کے کھلنے لگا۔ لطف یہ ہے کہ عبدالرحمن کو اس بات کے متعلق خبر نہ تھی کہ میری وجہ سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے۔ اور میری سفارشوں کے باعث کمپنی کے دوسرے ڈائریکٹر اس سے کام لینے لگے ہیں۔

فلم کمپنی میں کام کرنے کے علاوہ میں وہاں کے ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کو ایڈٹ کرتا ہوں۔ ایک روز میں نے اپنا اخبار عبدالرحمن کے ہاتھ میں دیکھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مسکرا کر اس نے پرچے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ”منشی صاحب — یہ رسالہ آپ ہی —“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

”ماشاء اللہ، کتنا خوبہ درت پرچہ نکالتے ہیں آپ کل رات اتفاق سے یہ میرے ہاتھ

آگیا۔ بہت دلچسپ ہے، اب میں ہر ہفتے خرید کر دوں گا۔“

یہ اس نے اس انداز میں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہے، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، چنانچہ بات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جبکہ میں اسٹوڈیو کے باہر نیم کے پیڑ تلے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اپنے اخبار کے لئے ایک کالم لکھ رہا تھا۔ عبدالرحمن آیا اور بڑے ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”فرمائیے۔“

”آپ فارغ ہو جائیں تو میں۔“

”میں فارغ ہوں۔ فرمائیے آپ کو کیا کہنا ہے۔“

اس کے جواب میں اس نے ایک رنگین لفافہ کھولا اور اپنی تصویر میری طرف بڑھادی۔ تصویر ہاتھ میں لیتے ہی جب میری نظر اس پر پڑی تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی، یہ ہنسی چونکہ بے اختیار آئی تھی۔ اس لئے میں اسے روک نہ سکا۔ بعد میں جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عبدالرحمن کو یہ ناگوار معلوم ہوئی ہوگی تو میں نے کہا۔ ”عبدالرحمن صاحب، اتفاق دیکھئے، میں صبح سے پریشان تھا کہ ٹائٹیل پیج کے بعد کا صفحہ کیسے پر ہوگا، دو تصویروں کے بلاک مل گئے تھے۔ مگر ایک کی کمی تھی۔ اس وقت بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ نے اپنا ٹوٹو میری طرف بڑھادیا۔ بہت اچھا ٹوٹو ہے۔ بلاک بھی اس کا خوب بنے گا۔“

عبدالرحمن نے اپنے موٹے ہونٹ اندر کی طرف سکیڑ لئے ”آپ کی بڑی عنایت ہے۔ تو۔۔۔ کیا یہ تصویر چھپ جائے گی؟“

میں نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور مسکرا کر کہا، کیوں نہیں اس ہفتے ہی کے لئے تو میں یہ کہہ رہا تھا۔“

اس پر عبدالرحمن نے دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ ”پرچہ میں تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوٹ بھی نکل جائے تو میں اور بھی ممنون ہوں گا۔ جیسا آپ مناسب خیال فرمادیں۔ تو۔۔۔ معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں خلل ہو رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ ملتا ہوا چلا گیا۔

میں نے اب تصویر کو فور سے دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی، ایک ہاتھ میں بھاری بھر کم ڈائریکٹری تھی جس پر چھپے ہوئے حرف بتا رہے تھے کہ کن سولہ کی یہ کتاب نوٹو گرافر نے اپنے گاہکوں کو تعلیم یافتہ دکھانے کے لئے ایک یادو آنے میں خریدی ہوگی۔ دوسرے ہاتھ میں جواو پر کو

اٹھا ہوا تھا ایک بہت بڑا پاپ تھا۔ اس پاپ کی ٹوٹی عبد الرحمن نے اس انداز سے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تھی معلوم ہوتا تھا کہ چائے کا پیالہ پکڑے ہے، لبوں پر چائے کا گھونٹ پیٹے وقت جو ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا کرتا ہے وہ تصویر میں اس کے ہونٹوں پر جما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں کسرے کی طرف دیکھنے کے، باعث کھل گئی تھیں۔ ناک کے نتھنے تھوڑے پھول گئے تھے۔ سینے میں ابھار پیدا کرنے کی کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی، کیونکہ وہ اچھا خاصا کارٹون بن گیا تھا یاد رہے کہ عبد الرحمن انگریزی پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتا اور تمباکو سے پرہیز کرتا ہے۔

میں نے اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے اس کے نوٹوں کا بلاک بنوایا اور وعدے کے مطابق تعریفی نوٹ کے ساتھ پرچے، میں چھپوایا۔

دوسرے روز دس بجے کے قریب میں کہنی کے غلیظ ریسٹوران میں بیٹھا کڑوی چائے پی رہا تھا کہ عبد الرحمن تازہ پرچہ جس میں اس کی تصویر چھپی تھی۔ ہاتھ میں لئے داخل ہوا اور آداب عرض کر کے میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ اندر کی طرف سمٹ رہے تھے۔ آنکھوں کے آس پاس کا گوشت سکڑ رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ممنون ہو رہا ہے، بغل میں پرچہ دب کر اس نے ہاتھ بھی ملنے شروع کر دیئے، شکریے کے کئی فقرے اس نے دل ہی دل میں بنائے ہوں گے۔ مگر ناموزوں سمجھ کر انہیں منسوخ کر دیا ہو گا۔ جب میں نے اسے اس ادھیڑ بن میں دیکھا تو ماتم پرسی کے انداز میں اس سے کہا ”تصویر چھپ گئی آپ کی — نوٹ بھی پڑھ لیا، آپ نے؟“

”جی ہاں — آپ — کی بڑی نوازش، ہے۔“

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ درد بہت پرانا ہے۔ جس کے دورے اکثر مجھے پڑتے رہتے ہیں۔ میں اس کے دفیے کے لئے سینکڑوں علاج کر چکا ہوں مگر لا حاصل، چائے پیتے پیتے یہ درد ایک دم اٹھا۔ اور سارے سینے میں پھیل گیا۔ عبد الرحمن نے میری طرف غور سے دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”آپ کے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔“

میں اس وقت ایسے موڈ میں تھا کہ دشمنوں کو بھی اس موڈی مرض کا شکار ہوتے دیکھ سکتا۔ چنانچہ میں نے بڑے روکھے پن سے کہا، کچھ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

”جی نہیں، آپ کی طبیعت ناساز ہے —“ وہ سخت گھبرا گیا۔ ”میں آپ کی خدمت

کر سکتا ہوں۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ مطلق فکر نہ کریں، سینے میں معمولی سا درد ہے۔ ابھی

ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سینے میں درد ہے“ — یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ ”سینے میں درد ہے تو — اس کا مطلب ہے کہ آپ کو قبض ہے اور قبض —“

قریب تھا کہ میں بھٹا کر اس کو دو تین گالیاں سنا دوں مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔

”آپ — حد کرتے ہیں۔ آپ — سینے کے درد سے قبض کو کیا تعلق؟“

”جی نہیں — قبض ہو تو ایک سوا ایک بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور سینے کا درد تو یقیناً قبض ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ کی آنکھوں کی زردی صاف ظاہر کرتی ہے کہ آپ کو پرانا قبض ہے اور جناب، قبض کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو ایک دو روز تک اجابت نہ ہو۔ جی نہیں۔ آپ جس کو با فراغت سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ قبض ہو — سینہ اور پیٹ تو پھر بالکل پاس پاس ہیں۔ قبض سے تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے — میرا خیال ہے کہ آپ — دراصل آپ کی کمزوری کا، باعث بھی یہی قبض ہے۔“

عبدالرحمن چند لمحات کے لئے بالکل خاموش ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجے میں زیادہ چکنا چٹ پیدا کر کے کہا۔ ”آپ نے کئی ڈاکٹروں کا علاج کیا ہوگا — ایک معمولی سا علاج میرا بھی دیکھئے — خدا کے حکم سے یہ مرض بالکل دور ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کون سا مرض؟“

عبدالرحمن نے زور زور سے ہاتھ ملے۔ ”یہی — یہی قبض!“

لاحول ولا، اس بیوقوف سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے۔ صرف میرے سینے میں درد ہے جو کہ بہت پرانا ہے اور سب ڈاکٹروں کی محققہ رائے ہے کہ اس کا باعث اعصاب کی کمزوری ہے۔ مگر یہ نیم حکیم خطرہ جان برابر کہے جا رہا ہے کہ مجھے قبض ہے۔ قبض ہے، قبض ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غصے میں آ کر اس کے سر پر چائے کا پیالہ دے ماروں، عجب نامعقول آدمی ہے، اپنی طبابت کا پٹارہ کھول بیٹھا ہے اور سنتا ہی نہیں۔

غصے کے باعث میں بالکل خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کا، عبدالرحمن نے فائدہ اٹھایا اور قبض کا علاج بتانا شروع کر دیا، خدا معلوم اس نے کیا کچھ کہا —

”بات یہ ہے کہ پیٹ میں آپ کے سدے پڑ گئے ہیں۔ آپ کو ہر روز اجابت تو ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سدے باہر نہیں نکلتے معدے کا فعل چونکہ درست نہیں رہا۔ اس لئے انتڑیوں میں خشکی، پیدا ہو گئی ہے۔ رطوبت یعنی لیس دار مادہ جو فضلے کے نیچے پھیلنے، میں مدد دیتا ہے، آپ کے اندر

بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ رفع حاجت کے وقت آپ کو ضرورت سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہوگا۔ قبض کھولنے کے لئے عام طور پر جو انگریزی مسہل دوا کیں بازار میں بکتی ہیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس لئے کہ ان سے عادت پڑ جاتی ہے اور جب عادت پڑ جائے تو آپ خیال فرمائیے کہ ہر روز پاخانہ لانے کے لئے آپ کو دو تین آنے خرچ کرنے پڑیں گے۔ یونانی دوا کیں اول تو ہم لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہیں دوسرے۔

میں نے تنگ آ کر اس سے کہا۔ ”آپ چائے پیسے گے؟“ اور اس کا جواب سنے بغیر ہوٹل والے کو آڑ دیا۔ ”گلاب، ان کے لئے ایک ڈبل چائے لاؤ۔“

چائے فوراً ہی آگئی۔ عبدالرحمن کرسی کھینٹ کر بیٹھا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”معاف کیجئے گا، مجھے ڈائریکٹر صاحب سے سین کے متعلق بات چیت کرنا ہے، پھر گفتگو ہوگی۔“

یہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قبض کی باقی داستان عبدالرحمن کی زبان پر منجمد ہو گئی اور ریسٹوران سے باہر نکل گیا۔ درد شروع ہونے کے باعث میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس کی باتوں نے اس ملکہ میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیونکر اس بات پر مصر ہے کہ مجھے قبض ہے میری صحت دیکھ کر وہ کہہ سکتا تھا کہ مدقوق ہوں جیسا کہ عام لوگ میرے متعلق کہتے آئے ہیں۔ وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مجھے سل ہے میری استریوں میں درم ہے۔ میرے معدے میں رسولی ہے میرے دانت خراب ہیں مجھے گھٹیا ہے۔ مگر بار بار اس کا اس بات پر زور دینا کیا معنی رکھتا تھا کہ مجھے قبض ہو رہا ہے یعنی اگر واقعی مجھے قبض تھا تو اس کا احساس مجھے پہلے ہونا چاہیے تھا نہ کہ حافظ عبدالرحمن کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھے قبض کا بیمار کیوں بنارہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر میں ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے ہیرو، ہیروئن اور تین چار ایکٹرسوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ چونکہ بادلوں کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی۔ اس لئے سب کو چھٹی تھی۔ جب مجھے ہیرو کے پاس بیٹھے تین چار منٹ گزر گئے تو معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرحمن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ایک ایکٹسر نے اس کے خلاف کافی زہر اگلا۔ دوسرے نے اس کی مختلف عادات کا مضحکہ اڑایا۔ تیسرے نے اس کے مکالمے ادا کرنے کی نقل اتاری۔ ہیرو کو حافظ عبدالرحمن کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اس کی بول چال میں زبان کی غلطیاں نکالتا رہتا ہے۔ ولن نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔ ”بڑا واہیات آدمی ہے صاحب، ہلکے ایک آدمی سے کہہ رہا تھا کہ میرا کیننگ بالکل فضول ہے۔ آپ اس کو ایک بار ڈراڈانٹ کر بتا دیجئے۔“

ڈائریکٹر صاحب مسکرا کر کہنے لگے: ”تم سب کو اس کے خلاف شکایت۔ مگر اسے میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔“

تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا۔ ”وہ کیا۔“

ڈائریکٹر صاحب نے پہلی مسکراہٹ کو طویل بنا کر کہا۔ ”وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے۔ جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا میں اس کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ مجھے قبض و بفس نہیں ہے۔ لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔ ابھی تک اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ مجھے قبض ہے، کئی علاج بھی مجھے بتا چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ، مجھے اس طرح ممنون کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

یہ کہنے سے کہ مجھے قبض ہے اور اس کا علاج بتانے سے — وہ مجھے ممنون کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ پھر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اسے صرف اسی مرض کا علاج معلوم ہے۔ یعنی اس کے پاس چند ایسی دوائیں موجود ہیں۔ جن سے قبض دور ہو سکتا ہے۔ چونکہ مجھے وہ خاص طور پر ممنون کرنا چاہتا ہے اس لئے ہر وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ جو نبی مجھے قبض ہو وہ فوراً علاج شروع کر کے مجھے ٹھیک کر دے۔ آدمی، دلچسپ ہے۔“

ساری بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ”ڈائریکٹر صاحب — آپ کے علاوہ حافظ، صاحب کی نظر عنایت خاکسار پر بھی ہے — میں نے کل ان کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے — خدا کا شکر ہے کہ میں ان کے اس حملے سے بچ گیا۔ اس لئے کہ مجھے قبض نہیں ہے۔“

اس گفتگو کے چوتھے روز مجھے قبض ہو گیا۔ یہ قبض ابھی تک جاری ہے، یعنی اس کو پورے دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میں کئی پیسٹ دوائیں استعمال کر چکا ہوں۔ مگر ابھی تک اس سے نجات حاصل نہیں ہوئی، اب میں سوچتا ہوں کہ حافظ عبدالرحمن کو اپنی خواہش پوری کرنے کا ایک موقع دے ہی دوں۔ کیا حرج ہے؟ — مجھے اس سے محبت تو ہے ہی نہیں۔“

قدرت کا اصول

قدرت کا یہ اصول ہے کہ جس چیز کی مانگ نہ رہے، وہ خود بخود یا تو رفتہ رفتہ بالکل نابود ہو جاتی ہے یا بہت کم یا ب — اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں سے کتنی اجناس غائب ہو گئی ہیں —

اجناس کو چھوڑیے فیشن لے لیجئے — کئی آئے اور کئی دفن ہوئے — معلوم نہیں کہاں — دنیا کا یہ چکر بہر صورت اسی طرح چلتا رہتا ہے — ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے —

ایک زمانہ تھا کہ لڑکیاں انگلیا کا استعمال بہت معیوب سمجھتی تھیں، مگر اب یہ بہت ضروری سمجھا جاتا ہے کہ سہارا ہے — امریکہ اور انگلستان سے طرح طرح کی انگلیاں آرہی ہیں — کچھ ایسی ہیں کہ ان میں کوئی اسٹریپ نہیں ہوتا — ایک انگلیا جو سب سے قیمتی ہے ”میدن فوم“ کہلاتی ہے اسے کوئی بڑھیا بھی پہن لے تو جوان دکھائی دیتی ہے —

اس سے بھی زیادہ شدید انگلیاں نورجہاں فلم ایکسٹریس نے ”چن وے“ میں پہنی تھی جس کی نمائش سے میرے جمالیاتی ذوق کو بہت صدمہ پہنچا تھا، مگر میں کیا کرتا — ہر شخص کو اپنی پسند کی چیز کھانے اور پہننے کی آزادی ہے —

تو ان انسان کی فطرت ہے — وہ کبھی ایک چیز پر قائم نہیں رہتا — اسی لیے اس کے گرد و پیش کا ماحول بھی بدلتا رہتا ہے — اگر آج اسے مرغیاں مرغوب ہیں تو مارکیٹ میں لاکھوں مرغیاں ایک دم آجائیں گی —

لیکن جب اس کا دل ان سے اکتا جائے گا — تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرغیاں

یا تو انڈے دینا بند کر دیں گی۔ یا اسے سسکیں گی نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اگر لوگ پانی پینا بند کر دیں تو سارے کنویں خشک ہو جائیں۔ دریا اپنے کو بیکار سمجھ کر اپنا رخ بدل لیں۔

میں آج سے پندرہ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ آرگنڈی (جسے رفل کہا جاتا تھا) کی بنی بنائی قمیضوں کا رواج عورتوں میں عام تھا۔ لیکن دو تین برسوں کے بعد یہ قمیضیں ایسے غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینک۔

اتنے برس گزر چکے تھے مگر اب یہ کپڑا جو جوانوں کی کھال کے مانند کڑا ہوتا تھا۔ کسی عورت کے بدن پر نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بنانا تو یکسر بند کر دیا گیا ہے۔ یا بہت کم مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔

میں اب اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہم جنسیت کا بازار پنجاب میں ہر جگہ گرم تھا۔ مردوں کی اکثریت اس غیر فطری فعل سے شغل فرماتی تھی۔ اور ایسے لڑکے بہ افراط موجود تھے جن کی ادائیں دیکھ کر نوخیز لڑکیاں بھی شرمائیں۔ ان کی چال ڈھال کچھ ایسی قیامت خیز ہوتی تھی کہ تعیش پسند مرد۔ اپنی عورتوں کو بھول جاتے تھے۔

میں اسی زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب لڑکیوں کے بدلے ان کی مخالف جنس کا دور دورہ تھا۔ میں اپنے مکان کی بیٹھک میں اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔

امر تر میں ہنگامے ہونا ان دنوں معمولی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے لیکن اپنے اس اندیشے کا ذکر ہندو دوست سے نہ کیا جو میرا ہم جماعت تھا۔

ہم دونوں گلی سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ بازار میں سب دوکانیں بند ہیں بڑی حیرت ہوئی کہ ماجر کیا ہے۔ ہم گلی کے باہر کھڑے تھے کہ اتنے میں شہر کا ایک بہت بڑا غنڈا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ اس لئے کہ وہ مجھے پہچانتا تھا کہ میں ایک ذی اثر آدمی کا بیٹا ہوں۔ سلام کرنے کے بعد اس نے میرے دوست کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوا:

”میاں صاحب بابو جی سے کہئے کہ یہاں کھڑے نہ رہیں۔ آپ انہیں اپنے مکان میں لے جائیں۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ جو خون خرابہ ہوا اس کا باعث میرا دوست تھا۔ اس کے کئی طالب

تھے — دو پارٹیاں بن گئی تھیں — جن میں اس کی وجہ سے لڑائی ہوئی جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے — شہر کا جو سب سے بڑا غنڈا تھا، چوتھے پانچویں روز اسے دوسری پارٹی نے اس قدر زخمی کر دیا کہ دس دن اسے ہسپتال میں رہنا پڑا جو اس کی غنڈا گردی کا سب سے برابر پکار ڈ تھا۔ اہل لاہور اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ یہاں ایک لڑکا ٹینی سنگھ کے نام سے منسوب تھا — جو گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اس کے ایک پرستار نے اسے ایک بہت بڑی موٹر کار دے رکھی تھی وہ اس میں بڑے ٹھاٹ سے آتا اور دوسرے لڑکے جو اسی کے زمرے میں آتے تھے — بہت جلتے — مگر لاہور میں اس وقت ٹینی سنگھ کا ہی طوطی بولتا تھا — میں نے اس کو دیکھا — واقعی خوبصورت تھا۔

اب یہ حال ہے کہ کوئی ٹینی سنگھ نظر نہیں آتا — کالجوں میں چلے جائیے وہاں آپ کو ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آئے گا جس میں نسوانیت کے خلاف کوئی چیلنج ہو، اس لئے کہ اب ان کی جگہ لڑکیوں نے لے لی ہے۔ قدرت نے ان کی انتہا کر دی۔



قرض کی پیتے تھے.....

ایک جگہ محفل جمی تھی۔ مرزا غالب وہاں سے اکتا کراٹھے باہر ہوا دارموجود تھا اس میں بیٹھے اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ ہوا دار سے اتر کر جب دیوان خانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مقرر اداس مہاجن بیٹھا ہے۔

غالب نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”اخواہ مقرر اداس — بھی تم آج بڑے وقت پر آئے۔ میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔“

مقرر اداس نے ٹیٹھ مہاجنوں کے سے انداز میں کہا۔ ”حضور روپوں کو بہت دن ہو گئے۔ فقط دو قسط آپ نے بھجوائے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے ہو گئے ایک پیسہ بھی آپ نے نہ دیا۔

اسد اللہ خاں غالب مسکرائے۔ ”بھی مقرر اداس دینے کو میں سب دے دوں گا۔ گلے گلے پانی دوں گا۔ دو ایک جائیداد میری باقی ہے۔“

”اجی سرکار — اس طرح بیوپار ہو چکا — نہ اصل میں سے نہ سود میں سے پہلا ہی ڈھائی ہزار وصول نہیں ہوا۔ چھ سو چھپن سود کے ہو گئے۔

مرزا غالب نے حقے کی نے پکڑ کر ایک کش لیا — لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے اس کو پہلے پانی دیتے ہیں۔ میں تمہارا درخت ہوں پانی دو تو انا ج پیدا ہو۔

مقرر اداس نے اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کی — جی دیوالی کو بارہ دن باقی رہ گئے ہیں کھاتہ بند کیا جائے گا۔ آپ پہلے روپے کا اصل سود ملا کر دستاویز بنادیں تو آگے کا نام لیں۔

مرزا غالب نے حقے کی نے ایک طرف کی۔ ”لو ابھی دستاویز لکھے دیتا ہوں شرط یہ ہے کہ دو ہزار ابھی ابھی مجھے اور دو۔“

متھر اداس نے تھوڑی دیر غور کیا۔ اچھا۔ میں ایشام منگواتا ہوں یہی ساتھ لایا ہوں۔
آپ منشی غلام رسول عرضی نوٹس کو بلا لیں۔ پرسود وہی سواروپہ سینکڑہ ہوگا۔
”لالہ کچھ تو انصاف کرو۔ بارہ آنے سود لکھوائے دیتا ہوں۔“

متھر اداس نے اپنی دھوتی کی لانگ دوسری بار درست کی۔ ”سرکار بارہ آنے پر بارہ برس بھی کوئی مہاجن قرض نہیں دے گا۔ آج کل تو خود بادشاہ سلامت کو روپے کی ضرورت ہے۔
ان دنوں واقعی بہادر شاہ ظفر کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو اپنے اخراجات کے لئے روپے پیسے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔

بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھا لیکن مرزا غالب شاعر تھے گو وہ اپنے شعروں میں اپنا رشتہ سپاہ گری سے جوڑتے تھے۔

یہ مرزا صاحب کے چالیسویں پینتالیسویں سال کی درمیانی عرصے کی بات ہے جب متھر اداس مہاجن نے ان پر عدم ادائیگی قرضہ کے باعث دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کیا مقدمے کی سماعت مرزا صاحب کے مربی اور دوست مفتی صدرالدین آزادہ کو کرنا تھی جو خود بہت اچھے شاعر اور غالب کے مداح تھے۔

مفتی صاحب کے مردھانے عدالت کے کمرے سے باہر نکل کر آواز دی لالہ متھر اداس مہاجن اور مرزا اسد اللہ خان غالب مدعا علیہ حاضر ہیں۔“

متھر اداس نے مرزا غالب کی طرف دیکھا اور مردھے نے کہا۔ ”ابھی دونوں حاضر ہیں“ مردھے نے روکھے پن سے کہا۔ ”تو دونوں حاضر عدالت ہوں۔“

مرزا غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر مفتی صدرالدین آزادہ کو سلام کیا۔ مفتی صاحب مسکرائے ”مرزا نوشہ یہ آپ اس قدر قرض کیوں لیا کرتے ہیں آخر معاملہ کیا ہے؟“

غالب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا کیا عرض کروں۔“ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔“ مفتی صدرالدین مسکرائے۔ ”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے“

غالب نے برکتہ کہا۔ ایک شعر موزوں ہو گیا ہے مفتی صاحب حکم ہو تو جواب میں عرض کروں۔“ فرمائیے۔“

غالب نے مفتی صاحب اور متھر اداس مہاجن کو ایک لحظہ کے لئے دیکھا اور اپنے منہ ص

امداز میں یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مئے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن !

مفتی صاحب بے اختیار ہنس پڑے ”خوب خوب— کیوں صاحب رستی حل گئی پر پل
نہ گیا آپ کے اس شعر کی میں تو ضرور داد دوں گا۔ مگر چونکہ آپ کو اصل اور سود سب سے اقرار ہے
عدالت مدی کے حق میں فیصلہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مرزا غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ مدی سچا ہے تو کیوں فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو
اور میں نے بھی سچی بات نثر میں نہ کہی لقم میں کہہ دی“

مفتی صدر الدین آزر دہ نے کاغذات قانون ایک طرف رکھے اور مرزا غالب سے
مخاطب ہوئے۔ اچھا تو زردگری میں ادا کر دوں گا۔ کہ ہماری آپ کی دوستی کی لاج رہ جائے۔

مرزا غالب بڑے خوددار تھے انہوں نے مفتی صاحب سے کہا۔ ”حضور ایسا نہیں ہوگا
— مجھے متھر اداس کارو پیہ دینا ہے۔ میں بہت جلد ادا کر دوں گا۔ مفتی صاحب مسکرائے۔ ”حضرت
روپیہ کی ادائیگی شاعری نہیں آپ تکلف کو برطرف رکھیے۔ میں آپ کا مداح ہوں مجھے آج موقعہ
دیتجے کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔“

غالب خفیف ہوئے۔ لاجول والا— آپ میرے بزرگ ہیں۔ مجھے کوئی سزا دیجئے
کہ آپ صدر الصدور ہیں۔“

”دیکھو تم ایسی باتیں مت کرو۔“

”تو اور کیسی باتیں کروں۔“

”کوئی شعر سنائیے۔“

سوچتا ہوں— ہاں ایک شعر رات کو ہو گیا تھا۔ عرض کئے دیتا ہوں
”فرمائیے“

ہم اور وہ سبب رنج آشنا دشمن

مفتی صاحب نے اپنے قانونی قلم سے قانونی کاغذ پر یہ حروف لکھے ہم اور وہ بے سبب
رنج آشنا دشمن، کہہ رکھتا ہے

مفتی صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ یہ شعر آسانی سے سمجھ میں آسکے والا نہیں لیکن وہ چونکہ
خود بہت بڑے شاعر تھے۔ اس لئے غالب کی دقیقہ بیانی کو فوراً سمجھ گئے۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت ہوئی مفتی صدرالدین آزاد نے مرزا غالب سے کہا
 ”آپ آئندہ قرض کی نہ پیا کریں۔“
 غالب جو شاید کسی شعر کی فکر کر رہے تھے۔ کہا۔ ایک شعر ہو گیا اگر آپ اجازت دیں تو
 عرض کروں۔“

مفتی صاحب نے کہا۔ ”فرمائیے۔ فرمائیے۔“
 مرزا غالب کچھ دیر خاموش رہے۔ غالباً ان کو اس بات سے بہت کوفت ہوئی تھی کہ مفتی
 صاحب ان پر ایک احسان کر رہے ہیں۔“
 مفتی صاحب نے ان سے پوچھا۔ ”حضرت آپ خاموش کیوں ہو گئے۔“
 ”جی کوئی خاص بات نہیں۔“

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
 ورنہ کیا بات کرنی نہیں آتی!
 ”آپ کو باتیں کرنا تو ماشا اللہ آتی ہیں۔“

”غالب نے جواب دیا۔ جی ہاں۔ لیکن بنانا نہیں آتیں۔“
 مفتی صدرالدین مسکرائے۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔ زردگری میں ادا کر دوں گا۔“
 مرزا غالب نے مفتی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ”آج آپ نے دوستی کے تمسک پر
 مہر لگا دی جب تک زندہ ہوں۔ بندہ ہوں۔“
 مفتی صدرالدین آزاد نے ان سے کہا ”آپ تشریف لیجائیے پر خیال رہے کہ روز
 روز زردگری میں ادا نہیں کر سکتا آئندہ احتیاط رہے۔“

مرزا غالب تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں غرق ہو گئے۔
 مفتی صاحب نے ان سے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“
 مرزا غالب چونک کر بولے۔ ”جی میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ شاید کچھ سوچنے
 کی کوشش کر رہا تھا۔
 کہ۔“

موت کا ایک دن معین ہے
 نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!
 مفتی صاحب نے ان سے پوچھا۔ کیا آپ کو رات بھر نیند نہیں آتی۔“

مرزا غالب نے مسکرا کر کہا۔ ”کسی خوش نصیب کو ہی آتی ہوگی۔“

مفتی صاحب نے کہا۔ آپ شاعری چھوڑیے۔ بس آئندہ احتیاط رہے۔“

مرزا صاحب اپنے انگر کے کی شکلیں درست کرتے ہوئے بولے آپ کی نصیحت پر چل کر ثابت قدم رہنے کی خدا سے دعا کروں گا۔ مفتی صاحب مفت کی زحمت آپ کو ہوئی نقد اسوائے شکر ہے اور کیا ادا کر سکتا ہوں خیر خدا آپ کو دس گنا دنیا میں ستر گنا آخرت میں دے گا۔

یہ سن کر مفتی صدر الدین آزر دہ لب مسکرائے۔ ”آخرت والے میں تو آپ کو شریک کرنا محال ہے۔ دنیا کے دس گنے میں بھی آپ کو ایک کوڑی نہیں دوں گا۔ کہ آپ مئے خواری کیجئے۔“

مرزا غالب بنے۔ میخواری کیسی مفتی صاحب۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

اور یہ شعر تا کر مرزا غالب عدالت کے کمرے سے باہر چلے گئے۔



(منی کہانی)

قسمت

”کچھ نہیں دوست

— اتنی محنت

کرنے پر صرف ایک

بکس ہاتھ لگا تھا پر

اس میں بھی سالا سورا

کا گوشت نکلا۔“

☆☆

قیے کی بجائے بوٹیاں

ڈاکٹر سعید میر اہم سایہ تھا۔ اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ سے زیادہ دوسو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ اس کی گراؤنڈ فلور پر اس کا مطب تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا۔ ایک دو گھنٹے کی تفریح ہو جاتی۔ بڑا بذلہ رخ، ادب شناس اور وضع دار آدمی تھا۔

رہنے والا جنگور کا تھا۔ مگر گھر میں بڑی سستہ و رفتہ اردو میں گفتگو کرتا تھا اس نے اردو کے قریب قریب تمام بڑے شعرا کا مطالعہ کچھ ایسے ہی انہماک سے کیا تھا کہ جس طرح اس نے ایم بی بی ایس کورس کی جملہ کتابوں کا۔ میں کئی دفعہ سوچتا کہ ڈاکٹر سعید کو ڈاکٹر بننے کی بجائے کسی بھی مضمون میں ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنی چاہئے تھی۔ اس لئے کہ اس کی افتاد طبع کے لئے یہ نہایت موزوں و مناسب ہوتی۔

چنانچہ میں نے ایک روز اس سے کہا:

”ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ پروفیشن کیوں اختیار کیا؟
”کیوں“

میں نے ان سے کہا:

”آپ اردو، فارسی زبان کے بڑے اچھے پروفیسر ہوتے۔ بڑے ہر دلعزیز۔
طالب علم آپ کے گرویدہ ہوتے۔“
وہ مسکرایا:

”ایک ہی بات ہوتی۔ نہیں۔ زمین و آسمان کا فرق ہوتا۔ میں یہاں اپنے

تجے کی بجائے بوٹیاں

مطب میں بڑے اطمینان سے بیٹھا ہر روز کم از کم سوسو اسوروپے بنالیتا ہوں۔ اگر میں نے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کیا ہوتا تو مجھے کیا ملتا۔

”زیادہ سے زیادہ چھ سات سو روپے ماہوار۔“

میں نے ڈاکٹر سے کہا: ”بڑی معقول آمدنی ہے۔“

”آپ اسے معقول کہتے ہیں۔ سو روپے کے قریب تو میرا اپنا جیب خرچ ہے۔“

آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ میں شراب پینے کا عادی ہوں اور وہ بھی ہر روز۔ قریب قریب پچھتر روپے تو اس پر اٹھ جاتے ہیں۔ پھر سگریٹ ہیں۔ دوست یاروں کی تواضع ہے۔ یہ سب خرچ کیا ایک لیکچرر، پروفیسر، ریڈریا پرنسپل کی تنخواہ پورا کر سکتی ہے؟“

میں قائل ہو گیا۔

”جی نہیں۔ آپ ڈاکٹر نہ ہوتے۔ ادیب ہوتے، مصور ہوتے۔“ میری بات

کاٹ کر انھوں نے ایک چھوٹا سا تہقہ لگا کر کہا:

”اور فاقہ کشی کرتا“ میں بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر سعید کے اخراجات واقعی بہت زیادہ تھے، اس لئے کہ وہ کنجوس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے مطب سے فارغ ہو کر فرمت کے اوقات میں دوست یاروں کی محفل جمانے میں ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی بنگلور ہی کی تھی جس کے بطن سے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ اس کی بیوی اردو زبان سے قطعاً نا آشنا تھی، اس لئے اسے تنہائی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھی چھوٹی لڑکی آتی اور اپنی ماں کا پیغام ڈاکٹر کے کان میں ہولے سے پہنچا دیتی، اور پھر دوڑتی ہوئی مطب سے باہر نکل جاتی۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر سے میرا دوستانہ ہو گیا۔ بڑا بے تکلف قسم کا۔ اس نے مجھے اپنی گزشتہ زندگی کے تمام حالات و واقعات سنائے۔ مگر وہ اتنے دلچسپ نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے۔

اب میں نے باقاعدگی کے ساتھ ان کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ میں بھی چونکہ بوتل کا رسیا تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں گاڑھی چھیننے لگی۔ ایک دو ماہ کے بعد میں نے محسوس کیا۔

کہ ڈاکٹر سعید الجھسا رہتا ہے۔ اپنے کام سے اس کی دلچسپی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ پہلے تو میں اسے ٹوٹتا رہا، آخر میں نے صاف لفظوں میں اس سے پوچھا:

”یار سعید۔ تم آج کئی دن سے کھوئے کھوئے۔ کیوں رہتے ہو؟“

ڈاکٹر سعید کے ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی: ”نہیں تو۔۔۔“
 ”نہیں تو کیا۔۔۔ میں اتنا گدھا تو نہیں کہ پہچان بھی نہ سکوں کہ تم کسی ذہنی الجھن
 میں گرفتار ہو۔۔۔“

ڈاکٹر سعید نے اپنا وکی کا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں تک لے جا کر کہا: ”محض تمہارا اداہمہ
 ہے۔۔۔ یا تم اپنی نفسیات شناسی کا مجھ پر عرب گانٹھتا چاہتے ہو۔۔۔“

میں نے تمہارا ڈال دیے۔۔۔ حالانکہ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کے دل
 کا چور پکڑا جا چکا ہے۔ مگر اسے اپنی شکست کے اعتراف کا حوصلہ نہیں۔ بہت دن گزر گئے۔

اب وہ کئی کئی گھنٹے اپنے مطب سے غیر حاضر رہنے لگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں
 جاتا ہے کیا کرتا ہے، اس کی ذہنی پریشانی کا باعث کیا ہے، میرے دل و دماغ میں بڑی کھد بد ہو
 رہی تھی۔ اب اتفاقاً اگر اس سے ملاقات ہوتی تو میرا بے اختیار جی چاہتا کہ اس سے ایک بار پھر وہ
 سوالات کروں جن کے جواب سے میری ذہنی الجھن دور ہو اور ڈاکٹر سعید کے عقب میں جو کچھ
 بھی تھا، اس کی صحیح تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ مگر ایسا کوئی تخیلے کا موقع نہ ملا۔

ایک دن شام کو جب میں اس کے مطب میں داخل ہوا۔ تو اس کے نوکر نے مجھے روکا
 صاحب! ابھی اندر نہ جائیے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے ہیں۔“ ”تو دیکھا کریں۔“
 نوکر نے مؤذبانہ عرض کی۔ ”صاحب۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کہ
 مریض، عورت ہے۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ کب تک فارغ ہو جائیں گے۔۔۔ اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم ہے؟“
 نوکر نے جواب دیا:

”جی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ تقریباً ایک گھنٹے سے وہ بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے ہیں
 ۔۔۔ میں تھوڑے وقفے کے بعد مسکرایا۔

”تو مرض کوئی خاص معلوم ہوتا ہے۔۔۔“

اور یہ کہہ کر میں نے غیر ارادی طور پر ڈاکٹر سعید کے کمرہ تشخیص کا دروازہ کھول دیا۔ اور
 اندر داخل ہو گیا۔

کیا دیکھتا ہوں۔۔۔ کہ سعید ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تپائی پر پیڑ
 کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہیں، اور دونوں ٹوگھنگو ہیں۔ سعید اور وہ محترمہ مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔
 میں نے ازراہ تکلف ان سے معذرت طلب کی، اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سعید نے

پکارا: ”کہاں چلے — بیٹھو۔“ میں نے سعید سے کہا:

”میری موجودگی شاید آپ کی گفتگو میں مغل ہو“

سعید نے اٹھ کر مجھے کاندھوں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھادیا۔

”ہٹاؤ یا اس تکلف کو —“

پھر اس نے ایک خالی گلاس میں میرے لئے بیئر انڈیلی اور اسے میرے سامنے رکھ دیا:

”لو، پڑو۔“ میں نے دو گھونٹ بھرے تو سعید نے اس ادھیڑ عمر کی عورت سے جو لباس اور زیوروں سے کافی مالدار معلوم ہوتی تھی — تعارف کرایا۔

”سلے رحمانی — اور یہ میرے عزیز دوست سعادت حسن منٹو۔“

”سلے رحمانی چند ساعتوں کے لئے مجھے بڑے غور اور تعجب سے دیکھتی رہی۔

”سعید — کیا واقعی یہ سعادت حسن منٹو ہیں — جن کے افسانوں کے سارے

مجموعے میں بڑے غور سے ایک نہیں، دو دو، تین تین مرتبہ پڑھ چکی ہوں —“ ڈاکٹر سعید نے اپنا گلاس اٹھایا۔

”ہاں، وہی ہیں — میں نے کئی مرتبہ خیال کیا کہ اس سے تمہارا غائبانہ تعارف

کرا دوں — پر میں نے سوچا تم اس نام سے یقیناً واقف ہوگی — شیطان کو کون نہیں جانتا۔“

سلے رحمانی یہ سن کے پیٹ بھر کے ہنسی — اور اس کا پیٹ عام بیٹوں کے مقابلے

میں کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔

اس کے بعد مسلے رحمانی سے کئی ملاقاتیں ہوئیں — پڑھی لکھی عورت تھی — بڑے

اچھے گھرانے سے متعلق تھی۔ تفتیش کیے بغیر مجھے اس کے متعلق چند معلومات حاصل ہو گئیں کہ وہ تین

خاوندوں سے طلاق لے چکی ہے — صاحب اولاد ہے — جہاں رہتی ہے — اس میں دو

چھوٹے چھوٹے کمرے اور ایک غسل خانہ ہے۔ وہاں اکیلی رہتی ہے۔ غیر منقولہ جائیداد سے اس

کی آمدن چار پانچ سو روپے ماہوار کے قریب ہے۔ ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتی ہیں۔

ان انگوٹھیوں میں سے ایک میں نے دوسرے روز شام کو سعید کی انگلی میں دیکھی۔

تیسرے روز کو ڈاکٹر سعید کے مطب میں سلے رحمانی موجود تھی دونوں بہت خوش تھے

اور چہچہا رہے تھے — میں بھی ان کی بیئر نوشی میں شریک ہو گیا۔

پچھلے ایک ہفتے سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر سعید کے کمرے کے شخص سے کچھ دور جو کمرے

خالی پڑے رہتے ہیں، ان کی بڑی توجہ سے مرمت کرائی جا رہی ہے — ان کو ایسا بنایا جا رہا ہے۔

فرنیچر جب لایا گیا تو وہی تھا جو میں نے سلمیٰ رحمانی کے گھر دیکھا تھا۔

اتوار کو ڈاکٹر سعید کی چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ کواڑ بند رہتے تاکہ اس کو تنگ نہ کیا جائے۔
مجھے تو وہاں ہر وقت آنے جانے کی اجازت تھی۔ ایک اور چور دروازہ تھا اس کے
ذریعے میں اندر پہنچا۔ اور سیدھا ان دو کمروں کا رخ کیا جن کی مرمت کرائی گئی تھی۔
دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو حسب توقع ڈاکٹر سعید کی بغل میں سلمیٰ رحمانی بیٹھی تھی۔

سعید نے مجھ سے کہا:

”میری بیوی سلمیٰ رحمانی سے ملو۔“

مجھے اس عورت سے کیا ملنا تھا۔ سینکڑوں بار مل چکا تھا۔ لیکن اگر کسی عورت کی
شادی ہو تو اس کو کن الفاظ میں مبارک باد دینی چاہئے۔ اس کے بارے میں میری معلومات
صفر کے برابر تھیں۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ لیکن کہنا بھی کچھ ضرور تھا۔ اس لئے جو منہ میں
آیا باہر نکال دیا: ”تو آخر اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔“

میاں بیوی دونوں ہنسے۔

سعید نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ بیسر پیش کی۔ اور ہم شادی کے علاوہ دنیا کے ہر موضوع پر دیر
تک گفتگو کرتے رہے۔

میں شام پانچ بجے آیا تھا۔ گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے۔ میں نے سعید سے کہا:
”لو بھئی۔ میں چلا۔ باتوں باتوں میں اتنی دیر ہو گئی ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔“
سعید کے بجائے سلمیٰ رحمانی۔ معاف کیجئے گا، سلمیٰ سعید مجھ سے مخاطب ہوئیں:

”نہیں، آپ نہیں جاسکتے۔ کھانا تیار ہے۔ اگر آپ کہیں تو لگوادیا جائے۔“
خیر، سعید اور اس کی ننی بیوی کے پیہم اصرار پر مجھے کھانا، کھانا پڑا۔ جو بہت خوش
ذائقہ اور لذیذ تھا۔

دو برس تک ان کی زندگی بڑی ہموار گزرتی رہی۔ ایک دن میں ناسازی طبعیت
کے باعث بستر ہی میں لیٹا تھا کہ نوکر نے اطلاع دی: ”ڈاکٹر سعید صاحب تشریف لائے ہیں۔“
میں نے کہا۔

”اندر۔ جاؤ، ان کو اندر بھیج دو۔“

سعید آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہے۔ اس نے مجھے کچھ
پوچھنے کی زحمت نہ دی اور اپنے آپ بتا دیا کہ سلمیٰ سے اس کی ناچاقی شروع ہو گئی ہے، اس لئے کہ

تیجے کی بجائے بوٹیاں

وہ خود سورت ہے، کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ میں نے صرف اس لئے اس سے شادی کر لی کہ وہ اکیلی تھی۔ اس کے عزیز واقربا اسے پوچھتے ہی نہیں تھے جب وہ بیمار ہوئی۔ اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں تھی۔ ڈپتھریا تھا جسے خناق کہتے ہیں تو میں نے اپنا تمام کام چھوڑ کر اس کا علاج کیا اور خدا کے فضل و کرم سے وہ تندرست ہو گئی۔ پر اب وہ ان تمام باتوں کو پس پشت ڈال کر مجھ سے کچھ اس قسم کا سلوک کرتی ہے جو بے حد ناروا ہے۔“

تو آغاز کا انجام شروع ہو گیا تھا۔

چونکہ ڈاکٹر سعید کا گھر میرے گھر کے بالکل پاس تھا، اس لئے ان کی لڑائیوں کی اطلاعات ہمیں مختلف ذریعوں سے پہنچتی رہتی تھیں۔

سلئے کے ساتھ دونوں کرانیاں تھیں، بڑی تیز طرار اور ہنسی کئی۔ ان دونوں کے شوہر تھے۔ وہ ایک طرح اس کے ملازم تھے۔ اس کے اشارے پر جان دے دینے والے۔ اور ڈاکٹر سعید بڑا نحیف اور مختصر مرد۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سعید اور سلئے نے پی رکھی تھی کہ آپس میں دونوں کی جھج ہو گئی۔ ڈاکٹر نے معلوم نہیں نشے میں کیا کہا کہ سلئے آگ بگولا ہو گئی۔

اس نے اپنی دونوں نوکرانیوں کو آواز دی۔ وہ دوڑی دوڑی اندر آئیں سلئے نے ان کو حکم دیا کہ ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کر دی جائے ایسی مرمت کہ ساری عمر یاد رکھے۔

یہ حکم ملنا تھا۔ کہ ڈاکٹر سعید کی مرمت شروع ہو گئی۔ ان دونوں نوکرانیوں نے اپنے شوہروں کو بھی اس سلسلے میں شامل کر لیا۔ لائیں، گھونسوں اور دوسرے تھرڈ ڈگری طریقوں سے اسے خوب مار پیٹا گیا کہ اس کا کچھ نکل گیا۔

افاق و خیزاں بھاگا وہاں سے، اور اوپر اپنی پرانی بیوی کے پاس پہنچ گیا جس نے مستعد نرس کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اس نے ان دو کمروں کا رخ قریب قریب دو ماہ تک نہ کیا۔ اب وہ سلئے سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ اب اس کو اپنے گھر سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ عورت جس سے میں نے شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ کیوں ابھی تک اس کے سر پر مسلط ہے۔ اس کے گھر سے چلی کیوں نہیں جاتی۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قیے کی بجائے بوٹیاں

”لغت بھیجواپنے سامان پر — چلی گئی ہے — بس ٹھیک ہے تم خوش تمہارا خدا خوش — چلو اسی خوشی میں وہ بئیر کی بخ بستہ بوتلیں پیئیں — جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں — اس کے بعد کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔“

سلے کے جانے کے بعد ڈاکٹر سعید کم از کم ایک ماہ تک کھو یا کھویا سارہا — اس کے بعد وہ اپنی نارل حالت میں آگیا — ہر شام اس سے ملاقات ہوتی — گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور ہنسی مذاق کرتے رہتے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت موسم کی تبدیلی کے باعث بہت مضطرب تھی۔
بستر میں لیٹا تھا کہ ڈاکٹر سعید کا ملازم آیا — اس نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں اور بلارہے ہیں — ایک ضروری کام ہے۔

میرا جی تو نہیں چاہتا تھا — کہ بستر پر سے اٹھوں — مگر سعید کو نا امید نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے شہر والی پہن کر اس کے یہاں پہنچا —

مکان کے باہر دیکھا — کہ چار دیکھیں چڑھی ہیں —
قصائی دھڑا دھڑا بوٹیاں کاٹ کاٹ کر صف کے ایک کلوے پر پھینکے چلا جا رہا ہے۔ آس پاس کے کئی آدمی جمع تھے۔

میں سمجھا شاید کوئی نذرین زدی جا رہی ہے — میں نے گوشت کا وہ بڑا سا ٹکڑا دیکھا — جس پر کلہاڑی چلائی جا رہی تھی — اس کے ساتھ دو بانہیں تھیں — بالکل انسانوں کی مانند —!

میں نے پھر غور سے دیکھا — قطعی طور پر انسانی بانہیں تھیں —
سمجھ میں نہ آیا — یہ قصہ کیا ہے قصائی کی چھری اور کلہاڑی چل رہی تھی — چار دیکوں میں پیاز سرخ کی جا رہی تھی — اور میرا دل — دماغ ان دونوں کے درمیان پھنستا اور دھنستا چلا جا رہا تھا — کہ ڈاکٹر سعید نمودار ہوا مجھے دیکھتے ہی پکارا:

”آئیے — آئیے — آپ کے کہنے کے مطابق قیمہ تو نہ بن سکا — مگر یہ بوٹیاں تیار کرائی گئی ہیں — ابھی اچھی طرح بھونی نہیں گئیں — ورنہ میں آپ کو ایک بوٹی پیش کرتا — یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مرج مصالحہ ٹھیک ہے یا نہیں:“

”یہ سن کر پہلے مجھے متلی آئی — اور پھر میں بے ہوش ہو گیا —“

Handwritten text in Arabic script, appearing as bleed-through from the reverse side of the page. The text is arranged in approximately 20 horizontal lines, covering most of the page area.

اشاریہ
(منٹو کے افسانے - حصہ ”ع، غ، ف، ق“)

جیالشا
(تعمیل میں "تعمیل" کے ساتھ)

بیلیو گرافی

عنوان افسانہ مشمولہ: افسانوی مجموعہ / رسالہ / ماہ و سن اشاعت کیفیت

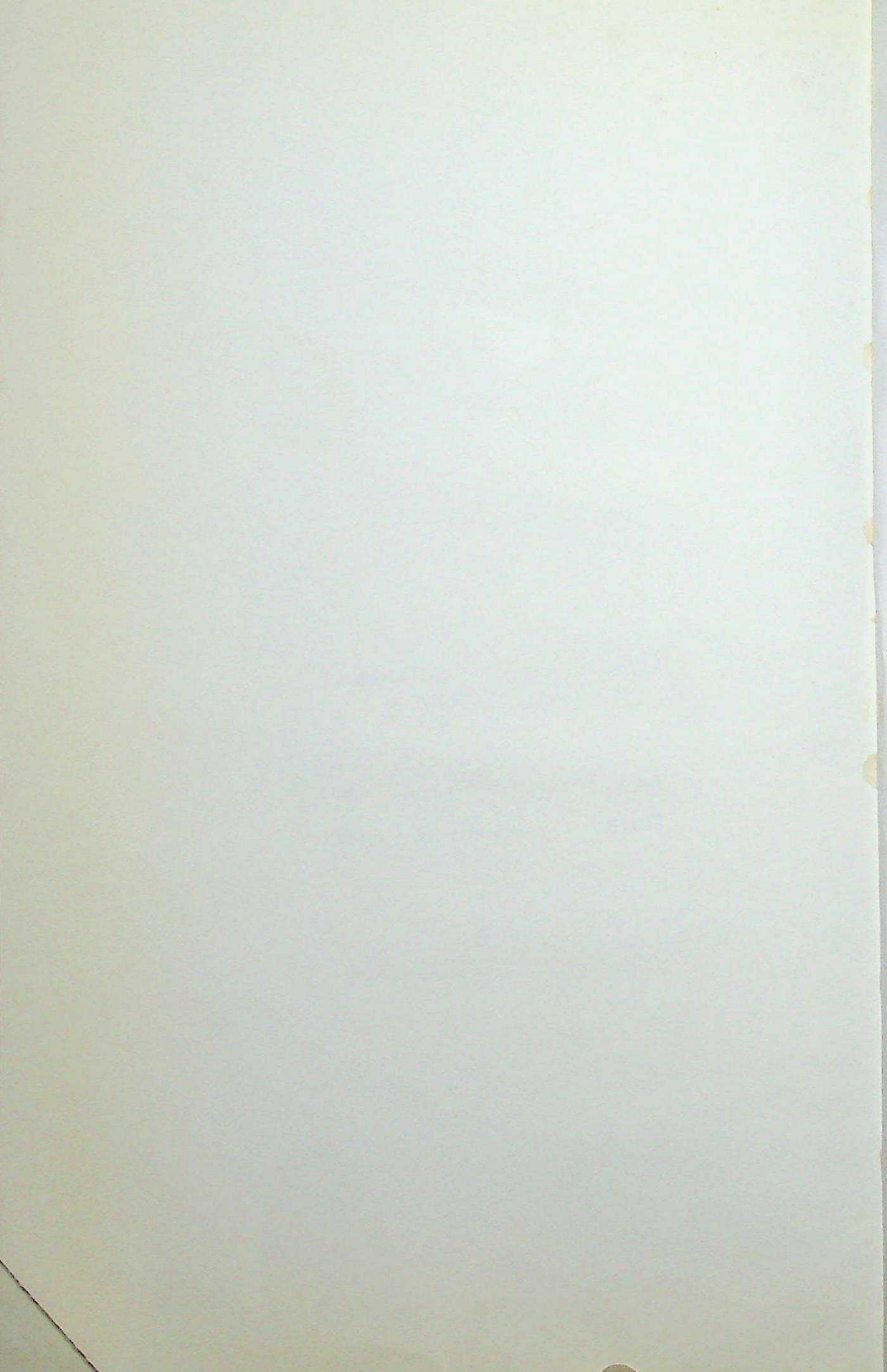
- ۱۔ عزت کے لئے ”نمرد کی خدائی“ ۱۹۵۲ء
- ۲۔ عشق حقیقی ”بادشاہت کا خاتمہ“ ۵ جون ۱۹۵۰ء
- ۳۔ عشقیہ کہانی ”پھندے“ ۱۹۵۳ء
- ۴۔ عقل داڑھ ”منو کے گم شدہ اور مرتب: بلراج مین را“ ۱۹۹۲ء
- ۵۔ عورت ذات ”بادشاہت کا خاتمہ“ ۳ جون ۱۹۵۰ء
- ۶۔ غالب، چودھویں اور حشمت خاں ”تلخ، ترش اور شیریں“ ۱۹۵۳ء
- ۷۔ غسل خانہ ”افسانے اور ڈرامے“ ۱۹۳۳ء
- ۸۔ فرشتہ ”پھندے“ ۱۹۵۳ء
- ۹۔ فوجبابائی ”بادشاہت کا خاتمہ“ ۱۲ جون ۱۹۵۰ء
- ۱۰۔ قادر اقصائی رسالہ ”نقوش“ لاہور ۱۹۵۵ء منو نمبر
- ۱۱۔ قبض ”دھواں“ ۱۹۴۱ء
- ۱۲۔ قدرت کا اصول ”بغیر اجازت“ ۱۹۵۵ء
- ۱۳۔ قرض کی پیتے تھے ”برقعے“ ۱۹۵۵ء
- ۱۴۔ قسمت ”سیاہ حاشیے“ ۱۹۴۸ء
- ۱۵۔ قیے کی بجائے بوٹیاں ”بغیر اجازت“ ۱۹۵۵ء

درجہ "تم سب کو اس کے نکالی کتاب" - ۱۲۷۲

درجہ "تم سب کو اس کے نکالی کتاب" - ۱۲۷۲

۱	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۲	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۳	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۴	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۵	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۶	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۷	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۸	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۹	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۰	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۱	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۲	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۳	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۴	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۵	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۶	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۷	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۸	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۱۹	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	
۲۰	کتاب "تم سب کو اس کے نکالی کتاب"	۱۲۷۲	

★★



G.M. College of Education
Raipur, Pantalab
Jammu

Acc NO.... 3289 (11)

Dated..... 6-6-19

سعادت حسن منٹو کی دیگر کتب

۳۵۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے افسانے—جلد اول)
۳۵۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے افسانے—جلد دوم)
۳۵۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے افسانے—جلد سوم)
۲۰۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے خاکے)
۳۰۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے مضامین)
۵۰۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	گلیات منٹو (منٹو کے ڈرامے)
۶۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	بغیر عنوان کے (منٹو کا ناول)
۴۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	انارکلی (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۱)
۴۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	بانجھ (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۲)
۶۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	پہاں (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۳)
۶۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	ٹوبہ یک سنگہ (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۴)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	جاگتی (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۵)
۸۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	خوشیا (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۶)
۸۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	دس روپے (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۷)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	سوراج کے لئے (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۸)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	شغل (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۹)
۷۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	عزت کے لئے (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۱۰)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	کالی شلوار (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۱۱)
۷۵/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	مٹی (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۱۲)
۱۰۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	نیا قانون (گلیات منٹو—افسانے، جلد ۱۳)
۱۱۵/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	آؤ! (اور دیگر ڈرامے)
۸۵/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	ایک مرد (اور دیگر ڈرامے)
۱۲۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	تیرہ می لکیر (اور دیگر ڈرامے)
۱۲۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	جرم اور سزا (اور دیگر ڈرامے)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	کٹاری (اور دیگر ڈرامے)
۹۰/- روپے	تحقیق متن و تدوین ڈاکٹر ہمایوں اشرف	سعادت حسن منٹو	ہک (اور دیگر ڈرامے)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)

PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

